سہ زور، شہ زور

محی الدین نواب

یہ ہمارے ملک کی بد قسمتی ہے کہ چند شہ زوروں نے پوری قوم کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ چھ عشرے گزرنے کے بعد بھی یہ آثار نظر نہیں آتے کہ کبھی قانون کی حکمرانی ہو گی اور انصاف غریب کی دہلیز پر پہنچے گا۔ دولت، مکاری اور بدمعاشی پر مبنی سہ رنگی قوتوں نے ہماری سیاست کو اتنا بد رنگ اور بدہیئت کر دیا ہے کہ کوئی بھی معزز اور تعلیم یافتہ شخص اسے اپنانے پر آمادہ نہیں ہوتا...بلکہ اس سے بے زار اور متنفر نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر داستان بھی ان تین بدرنگیوں کے بل پر شہ زور بن جانے والوں کی نقاب کشائی ہے جو اپنی طاقت کے نشے میں بدمست، اندھیر مچائے ہوئے تھے غریبوں اور مخالفوں کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ پھر یکا یک ہی ایسے فرعونوں کی طاقت ان سے چھن گئی اور وہ مٹی کے حقیر کیڑے جیسے ہو گئے

آدمی بڑا ہو، قد آور، صحت مند، دولت مند اور اقبال مند ہو، اسے وسیع ذرائع اور اختیارات حاصل ہوں تو صرف ایک چھوٹے سے نام سے گزارہ نہیں ہوتا۔ وہ اس شخصیت کی مناسبت سے نام کو بھی قد آور بنانا چاہتا ہے۔

کبھی اس کا نام صرف شوکت علی تھا۔ باپ کی وفات کے بعد پورے علاقے کی ذمے داری ورثے میں ملی تو اس نے نام میں ترمیم کی۔ شوکت علی سے... شوکت اکبر علی بن گیا۔

جب الیکشن جیت کر اسمبلی میں پہنچا تو اپنے نام میں جلال الدین کا اضافہ کیا اور شوکت جلال الدین اکبر علی کہلانے لگا۔ مقدر کا ستارہ چمک رہا تھا۔ اسے ایک شعبے کی وزارت مل گئی۔ کامیابی و کامرانی کا دور دورہ تھا۔ اس نے اپنے نام میں کامرانی کا اضافہ کیا اور شوکت جلال الدین اکبر علی کامرانی بن گیا۔

وہ جاگیرداری اور سیاسی سرگرمیوں کے ذریعے مشہور و معروف ہو رہا تھا۔ لیکن نام کے حوالے سے بھی خوب نمایاں رہنا چاہتا تھا۔ اسے صرف وزارت ملی تھی... بادشاہت مل جاتی تو جہانگیر اور عالمگیر بھی کہلانے لگتا۔

فی زمانہ اپنی حکمرانی سے پہلے غنڈا راج قائم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ غنڈوں کی مدد سے اسمبلیوں میں پہنچنا قدرے آسان ہو گیا ہے۔ اپنی طاقت منوانے کے لیے مسلح فوج بنائی جائے تو سیکڑوں ہزاروں سپاہیوں کو تنخواہیں دینی پڑتی ہیں۔ غنڈے مار پیٹ، قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے ذریعے عوام سے اپنی تنخواہیں وصول کر لیتے ہیں۔ سیاست والوں کو اپنی جیب سے کچھ دینا نہیں پڑتا۔ بس چھوٹ دینی پڑتی ہے۔

شوکت آباد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا تاہم بعد میں چھوٹے سے ٹاؤن میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ترقی کی وجہ منشیات کا کاروبار تھا۔ سرحدی علاقے سے افیون، چرس اور ہیروئن آتی تھی۔ شوکت جلال الدین اکبر علی کامرانی کے حکم کے بغیر اینٹی نارکوٹکس والے ادھر چھاپا مارنے نہیں آتے تھے۔ اچانک آتے بھی تھے تو اس جاگیردار کے پالتو غنڈوں کو پہلے سے خبر ہو جاتی تھی۔

آس پاس کے بڑے بڑے شہروں سے حتیٰ کہ کراچی سے بڑی بڑی گاڑیوں میں منشیات کے خریدار آتے تھے۔ ان کے لیے رہائشی ہوٹل، شراب خانے اور قمار خانے قائم کیے گئے تھے۔ وہاں کسی کو قانون کا خوف نہیں تھا۔ وہ شوکت جلال الدین اکبر علی کامرانی کے زیرِ سایہ غنڈوں اور پولیس والوں کو بھتا دیتے تھے اور آرام سے دھندا جاری رکھتے تھے۔

ان غنڈوں کے سردار کا نام سردار خان تھا۔ پورے شوکت آباد میں وہ سردارا کے نام سے مشہور تھا۔ سیدھے سادے لوگ ہوں یا جرائم پیشہ افراد... سب ہی اس کے سامنے سر جھکاتے اور ہاتھ جوڑتے تھے۔ تھانے دار بھی اس کی اجازت کے بغیر کسی حواری پر ہاتھ نہیں ڈالتا تھا۔

سب ہی جانتے تھے کہ وہ شوکت علی کامرانی کا خاص بندہ ہے۔ اس کے تمام اہم رازوں کا امین ہے۔ شوکت علی کامرانی نے کتنے سیاسی مخالفین کو قتل کرایا ہے؟ کتنوں کی لاشیں غائب کر کے انہیں کہاں کہاں چھپایا گیا ہے؟ کتنی بیواؤں بیٹیوں کی عزتیں لوٹی گئی ہیں اور کیسے کیسے ہتھکنڈوں سے مخالفین کی زمینوں پر قبضہ جمایا گیا ہے؟ ان سب کا گمنام صرف سردارا ہی تھا۔

وہاں کے سب ہی لوگ اس سے خوف زدہ رہتے تھے۔ شوکت علی کامرانی بھی اپنے طویل اور پارعب نام کے باوجود سردارا کے نام سے گھبراتا رہتا تھا۔ نفسیات کے ماہرین اس کی بھرپور سرپرستی کرتے ہوئے یہ بات اس کے دماغ میں ڈالتا رہتا تھا کہ اس جاگیردار اور سیاست دان کی حمایت کے بغیر وہ ایک دن بھی اپنا دھندا نہیں چلا سکے گا۔ کسی بھی دن اس کی لاش کو اس کے جوتوں تلے دکھائی دے گا۔

دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ خوف کی وجہ بات سے مسلط ہوتا ہے۔ اگر ایک شہ زور کا راز کسی کمزور کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کمزور سے خوف زدہ رہنے لگتا ہے۔ یہ کہنا چاہیے کہ شوکت علی کامرانی اور سردارا دونوں ہی ایک دوسرے سے خوف زدہ رہتے تھے۔ اس لیے ایک کا ارگ مافیا اور دوسرے کا سیاسی دھندا کسی روک ٹوک کے بغیر چل رہا تھا۔

ویسے کوئی بھی غلط دھندا سہولت سے نہیں چلتا۔ کوئی رکاوٹ نہ ہو تب بھی الجھنیں ضرور پیدا ہو جاتی ہیں۔ سردارا نے بشریٰ کو دیکھا تو الجھ کر رہ گیا۔

وہ دوشیزہ ایسی زبردست تھی کہ "ٹھاہ" کر کے سیدھی دل میں لگی تھی۔ وہ پکا عیاش تھا۔ من پسند عورتیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ اس نے شادی خانہ آبادی اور اپنی آئندہ نسل کے متعلق پہلے نہیں سوچا تھا مگر بشریٰ کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اپنے خاص ساتھیوں سے پوچھا۔ "یہ کڑی کس کی ہے؟"

اس کے ایک ساتھی تیمور نے کہا۔ "استاد! کڑی کسی کی بھی ہو... آم کھانا ہے تو بول... یہ رس بھری تیری جھولی میں آ جائے گی۔"

سردارا کے تین خاص بندے تھے۔ بشارت، تیمور اور بڈھا ابلیس! اس بڈھے کا نام کچھ اور ہوگا مگر سب ہی اسے بابے ابلیس کہتے تھے۔ وہ ساٹھ برس کا صحت مند بوڑھا تھا۔ ایک شیطان کی ساری صفات اس میں موجود تھیں۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "چٹی چٹر کان آئی اے۔ جب اسے نمی کا کی تھی تب سوچا تھا کسی ویلے اٹھا کے کھیتوں میں لے جاؤں گا۔"

سردارا نے اس کے سر پر چپت مارتے ہوئے کہا۔ "بابے اکو سچ مچ ابلیس ہے۔ بچیوں پر نیت خراب کرتا ہے۔ اس کے لیے کان پکڑ لے۔ اسے بھی گندی نظر سے نہ دیکھنا۔ میں اس سجا جن سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہائیں...!" تینوں ماتحتوں نے اسے حیرانی اور بے یقینی سے دیکھا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "میں بیوی بچوں کے بکھیڑوں میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ پر عمر لنگ دی جاری اے۔ دھندے کو سنبھالنے کے لیے پتر شتر تو پیدا کرنے ہی پڑیں گے نا...."

سب نے قائل ہو کر سر ہلایا۔ بابے نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ "یعنی طوطیاں تے بابے... پلاؤ تے زردے... اوئے واہ! پھر تو ہم اسے عزت سے اٹھا کر تیرے ڈیرے پر پہنچائیں گے۔"

وہ اس کے سر پر پھر ایک چپت مارتے ہوئے بولا۔ "اسے پہلی واری سن رہا ہوں کہ کسی کو عزت سے بھی اغوا کیا جاتا ہے۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ بشارت نے کہا۔ "اودا ناں بشریٰ ہے۔ سلامت علی گجر کی دھی ہے۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں، گجر کتنے غیرت مند ہوتے ہیں۔ وہ تجھے رشتہ نہیں دیں گے۔"

وہ گھور کر بولا۔ "او کیوں نہیں دیں گے؟"

"وہ کسی کی منگ ہے۔ چٹھی کھل چکی ہے۔ اگلے برس دسویں پاس کر لے گی تو اس کی جنج آ جائے گی۔"

"اس سے پہلے میری جنج وہاں پہنچ سکتی ہے۔ میں رشتہ مانگنے جاؤں گا۔"

"جانے سے پہلے یہ بات پلے باندھ لے، ادھر سے انکار ہی ہوگا۔ ہم بدمعاشی سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں مگر کسی بھی شریف گھرانے سے عزت حاصل نہیں کر سکتے۔"

وہ حقارت سے بولا۔ "اونہہ... عزت کیا ہوتی ہے؟ یہی کہ لوگ ہمیں سلاماں کریں تو یہاں سب ہی سلام کرتے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمیں عزت سے بٹھانے کے لیے منجی پر دھلی ہوئی چادر لا کر بچھاتے ہیں۔"

تیمور نے کہا۔ "اوئے بھولیا! وہ ہمارے خوف سے ایسا کرتے ہیں۔"

"خوف ہی تو سب کچھ ہے۔ ماں کا خوف نہ ہو تو بچے اسے گالیاں دیں گے۔ استاد کا خوف نہ ہو تو سکول نہیں جائیں گے۔ پولیس اور حکمرانوں کا خوف نہ ہو تو قانون کی پابندی نہیں کریں گے۔ سیدھی سی بات ہے رب کا خوف نہ ہو تو کوئی اس کے آگے سجدہ نہ کرے۔"

بابے ابلیس نے کہا۔ "اور ہم نے تو پتا نہیں بچپن میں بھی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟ میتھوں تے کچ یاد نئیں اے..."

وہاں کسی کو یاد نہیں تھا، کبھی نماز پڑھنے کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ خدا کا نام بھی صرف قسم کھاتے وقت زبان پر آتا تھا۔ ایسے گناہ گاروں کی بستی میں بشریٰ جوان ہوئی تھی۔

وہ دسویں جماعت میں تھی۔ اگلے برس بورڈ کے امتحانات سے گزرنے والی تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ بدنصیبی کچی عمر میں بھی کڑے امتحانات سے گزارتی ہے۔ وہ غیر معمولی ذہانت کی حامل تھی۔ سب ہی کہتے تھے، وہ بورڈ کے امتحانات میں صرف پاس نہیں ہوگی بلکہ صوبے بھر میں اول پوزیشن حاصل کرے گی۔

اس کے باپ سلامت علی کے پاس ایک سوزوکی کیریئر تھی۔ وہ اس گاڑی کے ذریعے درجنوں مکانوں، دکانوں اور ہوٹلوں میں دودھ سپلائی کرتا تھا۔ ایک جوان بیٹا طارق بھینسوں کے باڑے میں اور دودھ بیچنے میں اس قدر مصروف رہتا تھا کہ اسے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ گھرانا بہت خوش حال تھا۔ اچانک ہی ان کی خوش حالی کو گرہن لگ گیا۔

سردارا اپنے حواریوں کے ساتھ اسی شام سلامت علی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔ "بولو سردارا! ادھر کیسے آ گئے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اب آ ہی گیا ہوں تو کیا بیٹھنے کو نہیں بولو گے؟"

"ہاں ہاں، بیٹھو اور بولو... دودھ منگواؤں یا لسی؟ میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکوں گا۔ دودھ کی گاڑی لے جانی ہے۔"

وہ اپنے حواریوں کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں بھی زیادہ ٹیم نہیں لوں گا۔ دودھ اور لسی پھر کبھی سہی۔ کام کی بات یہ ہے کہ میرا کوئی شریکے کوئی بزرگ نہیں ہے... اگر ہوتا تو وہ میرے لیے رشتہ مانگنے تمہاری چوکھٹ پر آتا۔"

یہ سنتے ہی سلامت علی ذرا تن کر بیٹھ گیا۔ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "بس آگے گل نہ کرنا۔ ہم گجر ہیں۔ اپنی برادری میں رشتہ کرتے ہیں اور میری دھی کی بات پکی ہو چکی ہے۔"

"ایسی پھیکی انکاری نہ کرو۔ یہ دیکھو، تمہارے سامنے کون بیٹھا ہے؟ تم سے کبھی سلام دعا نہیں رہی پھر بھی مجھے جانتے ہو گے۔ میرا نام ہوا کی طرح ہر ویڑے میں پہنچتا ہے۔ یہاں ہر سانس لینے والا مجھے جانتا ہے۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے حواری بھی اٹھ گئے۔ اس نے کہا۔ "ابھی تو جا رہا ہوں۔ کل شگن کی مٹھائیوں کے ساتھ آؤں گا۔"

سلامت علی نے گھور کر کہا۔ "کیا زبردستی ہے؟ جا... ادھر کا رستہ بھول جا..."

سردارا نے اسے شعلہ بار نگاہوں سے گھورا۔ پھر شانے پر پڑے ہوئے رومال کو اتار کر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "زبردستی کرنی ہوتی تو چوکھٹ پر سوالی بن کر نہ آتا۔ ایک واری کہہ دیا آؤں گا تو فیر آؤں گا..."

سلامت علی نے دھتکارنے کے انداز میں کہا۔ "اوئے جا جا! دفع ہو جا... آئے گا تو مٹھائیوں کے ساتھ چار موڈھوں پر جائے گا۔"

بشارت نے اپنی گن سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ "اوئے! میں ابھی تجھے چار موڈھوں پر چڑھا دوں گا۔"

اسی لمحے میں فائرنگ کی گونجتی ہوئی آواز کے ساتھ بشارت کے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی۔ سلامت علی کا بیٹا طارق باپ کے پیچھے دروازے پر گن لیے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "تم لوگوں کی بدمعاشیاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ گجروں کے منہ لگنے آئے ہو۔ پھر کبھی ادھر کا رخ کیا تو کوئی زندہ واپس نہیں جائے گا۔ چلو... شکل گم کرو۔"

سردارا غصے سے تلملا رہا تھا۔ شوکت آباد کے رہنے والے اس کے نام سے کانپتے تھے۔ کوئی اس سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ پہلی بار سلامت علی اور اس کا بیٹا اس زبردست سے زیر نہیں ہو رہے تھے۔ اسے پسپا ہونے پر مجبور کر رہے تھے۔

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا اپنے ڈیرے میں واپس آ گیا۔ ایسی شکست اور ذلت اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ اس وقت ڈیرے کے باہر ایک کتا بھونک رہا تھا۔ اس نے بشارت سے رائفل لے کر اسے گولی مار دی۔ رائفل کو زمین پر پٹختے ہوئے کہا۔ "میں ان باپ بیٹے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

تیمور نے کہا۔ ''غصہ تو ہمیں بھی آرہا ہے۔ یہ ذلت برداشت نہیں ہو رہی ہے۔''

بشارت نے کہا۔ ''تیری قسم سردارا! ہم خون کے گھونٹ پی رہے ہیں۔ تو بولے گا تو آج ہی شب خون ماریں گے۔''

بابے ابلیس نے سردارا کے قریب آ کر سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''میں بولوں گا تو پھر چھوڑ پڑے گی۔ اس لیے پہلے ہی سر جھکا دیا ہے۔ سردارا! عقل کی بات یہ ہے کہ دُم ہلانے والے کتے کو گولی مارو تو دوسرے کتے کاٹنے نہیں آتے۔ مگر سر جھکانے والی رعیت میں کوئی بھونکنے لگے تو سنبھل جانا چاہیے۔ پہلے دیکھنا سمجھنا چاہیے کہ اس کمزور کے پیچھے کون سی طاقت ہم پر بھونکنے کے لیے اُسے اُکسا رہی ہے؟''

سردارا نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر کہا۔ ''تو بڑی دور تک سوچتا ہے۔''

''کیوں نہ سوچوں اور سمجھوں؟ جب تم ننگے سے تھے' گلیوں میں ننگے پھرتے تھے، تب میں گبرو جوان تھا۔ تب سے جانتا ہوں' اس علاقے میں کون بلّی ہے اور کون چوہا...؟''

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''سلامت علی چوہا ہوتا تو تجھ جیسے خونخوار بلّے کے سامنے نہ غراتا۔ ہمارے ٹاؤن میں چار گجر خاندان بہت پیسے والے ہیں۔ ان کے پاس اسلحہ بھی ہے۔ آس پاس کے شہروں میں جتنے گجر ہیں، ان سے رشتے داریاں بھی ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک سلامت علی پر آنچ آئے گی تو سب ہی ہماری جان کو آجائیں گے۔''

بشارت نے کہا۔ ''اوئے بابے کھوسٹ! کیوں بزدلوں کی طرح بول رہا ہے؟ کیا ان دودھ بیچنے والوں سے ڈر گیا ہے؟''

''یہ سمجھنے کی بات ہے کہ ہم کب ڈرتے ہیں اور کب نہیں ڈرتے؟ ہم چھوٹے بڑے دکان داروں سے بھتا لیتے ہیں۔ ڈکیتیاں بھی ڈالتے ہیں۔ غریب مزدوروں اور کسانوں کی بہو بیٹیوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ وہ روتے گڑگڑاتے تھانے کے چکر لگاتے ہیں کیونکہ وہ کمزور ہیں۔''

وہ ذرا عاجزی سے بولا۔ ''تم سب میری باتوں کو دھیان سے سنو۔ ہم طاقت کے نشے میں ایک طاقتور کے بوہے پر چلے گئے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم ان سے ڈر جائیں گے۔ میں تو کہتا ہوں' پہلے ان کی طاقت کا حساب کرو۔ اگر وہ سوا سیر ہوئے تو ہم کیا کریں گے؟''

تیمور نے کہا۔ ''ہم لڑتے لڑتے مر جائیں گے، پر اُن کے آگے نہیں جھکیں گے۔''

سردارا نے کہا۔ ''اوئے! ہم یہاں لاکھوں روپے کا دھندا کر رہے ہیں۔ کیا اسے چھوڑ کر مر جائیں گے؟ یہ بابا سالا شیطان ہے۔ پر باتیں پتے کی کرتا ہے۔''

وہ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''یہ گجر پیسے والے ہیں۔ تھانے کچہری کے معاملے میں پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ پہلے یہ ملوم کرنا ہوگا کہ بات بڑھے گی تو ساڈے کامرانی صاب اور تھانے وار کیا کر سکیں گے؟''

''تو پھر آج ہی ملوم کرو۔ ہم وہاں سے کمزور بن کر آئے ہیں۔ یہ بے عزتی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔''

سردارا چارپائی پر چاروں شانے چت ہو کر بولا۔ ''ہمیں اپنی بہت بڑی کمزوری کو ماننا ہوگا۔ ہم لاکھوں کا دھندا چوپٹ نہیں ہونے دیں گے۔''

کسی بھی پہلو سے کمزور ہونے کا مطلب ہے کہ کسی نہ کسی کے دباؤ میں آنا۔ گجر پہلوانوں کے اکھاڑے میں اترنے کے بعد یہ معلوم کرنا ضروری ہو گیا تھا کہ سیاسی پہلوان شوکت جلال الدین اکبر علی کامرانی اور قانونی پہلوان تھانے دار سلطان بگا ان گجروں کو پچھاڑ سکیں گے یا نہیں؟

شوکت علی کامرانی اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ پتا نہیں کتنے دنوں میں واپس آنے والا تھا؟ وہ سلطان بگا سے ملنے تھانے پہنچ گیا۔ تھانے دار نے اسے دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آؤ سردارا! تم آتے ہو یا مجھے بلاتے ہو تو جیب بھاری ہونے لگتی ہے۔''

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''کوئی نئی واردات نہیں ہے۔ پھر بھی ڈیرے پر آؤ گے تو دس ہزار مل جائیں گے۔''

''او جی سردارا! بولو کیا پیو گے؟''

اس نے گھور کر پوچھا۔ ''خون پلاؤ گے؟''

بگا نے میز پر جھک کر پوچھا۔ ''کس کا...؟''

''سلامت علی گجر اور اس کے بیٹے کا۔''

''معاملہ کیا ہے؟''

''تم نے اس کی جوان دھی کو دیکھا ہے؟''

''ہاں۔ بشریٰ تو ہمارے سامنے کی کاکی ہے۔''

''اس پر میرا دل آ گیا ہے۔''

وہ ذرا پریشان ہو کر بولا۔ ''کیا بول رہے ہو؟''

''وہی جو سن رہے ہو۔ میں چاہتا تو اسے اٹھوا لیتا۔ سالی ان لڑکیوں کو چیرنے پھاڑنے میں دیر کیا لگتی ہے؟ پر پتا نہیں' اسے دیکھ کر بیاہ رچانے کا شوق کیسے پیدا ہو گیا؟''

''بیاہ...'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم ایک شریف خاندان میں بیاہ کرنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''کمال ہے۔ زندگی میں پہلی بار اک چنگا کام کرنا چاہتا ہوں اور تم حریان ہو رہے ہو۔''

''میرے بدن پر ایس ایچ او کی یہ وردی دیکھ رہے ہو؟ اسے پہن کر شاید میں کسی شریف گھرانے میں رشتے داری کر سکوں لیکن یہ بدن سے اترے گی تو بگا بدمعاش کہلاؤں گا۔ ہم سب بکے ہوئے بِکے ہوئے ہیں۔ کسی بھی شریف گھرانے کو لوٹ سکتے ہیں مگر کسی بھی گھرانے سے شرافت کا سرٹیفکیٹ نہیں لے سکتے۔''

''آج میرے ساتھ یہی ہوا ہے۔ سلامت علی نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اور تو اور اس کے بیٹے نے ہم پر گولی چلائی تھی۔''

''سردارا! سب ہی تر نوالے نہیں ہوتے۔ تم سب ہی کو چبائے بغیر نگل نہیں سکتے۔''

''میں انہیں چبا چبا کر نگل جاؤں گا۔''

''دانت ٹوٹ جائیں گے۔ کچھ لوگ لوہے کے چنے ہوتے ہیں۔''

''تم اُس دودھ بیچنے والے کو لوہے کا چنا کہہ رہے ہو؟''

''وہ اکیلا ہوتا تو دو کوڑی کا ہوتا۔ اس کی برادری یہاں سے دوسرے شہروں تک پھیلی ہوئی ہے۔ کسی پر بُرا وقت آتا ہے تو سب ہی دوڑے چلے آتے ہیں۔ تم خوامخواہ ان سے پھڈا نہ کرو۔''

''اگر کروں اور بات بگڑے تو تم کچھ نہیں کر پاؤ گے؟''

''صرف میری اور تمہاری بات نہیں ہے۔ کامرانی صاحب بھی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ لاہور اور گوجرانوالہ سے اس برادری کے کئی بندے صوبائی اور قومی اسمبلیوں میں ہیں۔ ہمارے کامرانی صاحب کے لیے ان سے نمٹنا آسان نہیں ہوگا۔''

وہ سن رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ تھانے دار کے سمجھانے سے یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ صرف ایک بشریٰ کو جبراً حاصل کرنے کے باعث اس کی بدمعاشی اوپر والوں تک پہنچ جائے گی۔ وہ قانون کی گرفت سے بچ نہیں پائے گا۔ منشیات کے دھندے اور لاکھوں روپے کی آمدنی سے بھی جائے گا۔

وہ وہاں سے اٹھ کر باہر آیا۔ اس کے تینوں حواری جیپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اگلی سیٹ پر آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ڈیرے چلو۔ میری کھوپڑی گھوم رہی ہے۔ وہ سالی میرے ہاتھ نہیں لگے گی۔''

تیمور نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔

بشارت نے کہا۔ ''استاد کا موڈ خراب ہے۔ پہلی دھار کا ٹھرا لاؤں گا۔ بولو تو کسی پٹاخے کو بھی نال لے آؤں؟ وہ تیرا غم غلط کرے گی۔''

''او آہو... کسی کی ایسی تیسی نہ کی تو وہ سالی کھوپڑی میں ناچتی رہے گی۔''

بابے ابلیس نے پوچھا۔ ''کچھ ملوم تو ہو تھانے دار نے کیا کہا ہے؟''

وہ جیپ کے باہر تھوکتے ہوئے بولا۔ ''ان گجروں کی رشتے داریاں دور تک ہیں۔ برادری کے دو چار بندے اسمبلیوں میں بھی ہیں۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو کامرانی صاب بھی میرے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔''

''مطلب یہ کہ وہ گجر ہم سے زیادہ ڈھاڈے ہیں۔ ہمیں ان سے ڈر کر دب کر رہنا پڑے گا؟''

''بکواس نہ کر۔ میں ڈرتا نہیں ہوں۔ میدان کا سپاہی ہوں۔ مجبوراً دو قدم پیچھے ہٹوں گا پھر دس قدم آگے بڑھوں گا۔''

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''وہ میرے اندر بھری ہوئی ہے۔ اسے چاہتے ہوئے بھی تھوک نہیں سکتا۔ خوشی سے نگلتا جا رہا ہوں۔ ابھی کچھ پتے نہیں پڑ رہا ہے' کیا کروں گا؟''

''آج رات خوب سوچاں کرو۔ دماغ وچ ٹھنڈ پڑے گی تو سویرنوں کوئی تدبیر آپ ہی آپ آجائے گی۔''

وہ ایک چوراہے سے گزر رہے تھے۔ ایسے ہی وقت سامنے سے آنے والی جیپ نے ان کا راستہ روک دیا۔ اس جیپ پر بشریٰ کا بھائی طارق گن لیے کھڑا تھا۔ بشارت نے فوراً ہی اٹھ کر اپنی گن سیدھی کی۔ طارق نے کہا۔ ''اوئے بدمعاشا! پیچھے دیکھ...''

سردارا اور اس کے حواریوں نے سر گھما کر دیکھا۔ پیچھے ایک اور جیپ آ کر رکی تھی۔ اس پر بھی کئی گن مین دکھائی دے رہے تھے۔ اس چوراہے پر اچانک ہی دہشت پھیل گئی۔ لوگ دور بھاگنے لگے۔ آس پاس کی دکانوں کے شٹر بند ہونے لگے۔ دو اور گاڑیاں قریب آ کر رک گئی تھیں۔ وہاں سے بھی کئی گن مین اتر کر آ رہے تھے۔ ایک تگڑے جوان نے سردارا کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنے کتے کو بول... ہتھیار پھینک دے۔''

سردارا نے بشارت کو اشارہ کیا۔ اس نے گن پھینک دی۔ طارق نے کہا۔ ''سردارا! اٹھو ابھی جس کے نشانے پر ہے' یہ بشریٰ کا ہونے والا خاوند اور میرا ہونے والا بہنوئی دارا شکوہ ہے۔ تُو شگن کی مٹھائیاں لانے والا ہے۔ پر کل تو بہت دور

ہے... یہ آج ہی تجھ سے نمٹ لے گا۔"

دارا شکوہ نے کہا۔ "تم لوگ غریب عورتوں اور مردوں پر جو ظلم کرتے ہو، اسے تو ہم دیکھتے ہیں اور چپ رہتے ہیں۔ کیونکہ معاملہ قانون اور پولیس کا ہے۔ ہمارے اس ٹاؤن میں تو کیا پورے ملک میں طرح طرح کی دھاندلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ پوری قوم تماشائی ہے مگر ہم اپنے معاملے میں یہ تماشا نہیں ہونے دیں گے۔"

سردارا نے کہا۔ "او کوئی تماشا نہیں ہوگا داریا...! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ تیری منگ ہے۔ جب معلوم ہوا تو ہم چپ چاپ وہاں سے چلے آئے۔ یہ جھگڑا ہمیں مکا دے۔ ہم بھی تیری طرف رخ نہیں کریں گے۔"

"تو دیکھ رہا ہے' ساری دکانیں بند ہو گئی ہیں۔ لوگ دور جا کر تجھے دیکھ رہے ہیں۔ ہم تیرا خوف ان کے دلوں سے نکال رہے ہیں۔ آج انہیں معلوم ہو رہا ہے کہ تجھے چوہا بھی بنایا جا سکتا ہے۔"

سردارا سن رہا تھا اور چپ چاپ خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔ دارا شکوہ نے کہا۔ "آج پہلا دن ہے۔ تیری اتنی... بےعزتی کافی ہے۔ چل گاڑی سے اتر اور یہاں سے پیدل جا..."

یہ کہہ کر اس نے اپنی گن نیچی کی۔ ایک فائر کیا اور اس جیپ کے ایک پہیے کو ناکارہ بنا دیا۔ وہ چاروں بڑکیں لگانا اور سینہ تان کر چلنا بھول گئے تھے۔ چپ چاپ اتر کر وہاں سے پیدل جانے لگے۔

وہ برسوں سے اس علاقے میں اپنی طاقت کا لوہا منواتے آئے تھے۔ ان کی پشت پر پولیس والے تھے اور سر پر ایک بااختیار سیاست دان کی چھتری تھی۔ کوئی ان کے آگے منہ کھولنے اور نظریں ملانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ وہ بھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پلک جھپکتے ہی شیر سے کتے بن جائیں گے۔

وہ ڈیرے پر پہنچ کر اندر ہی اندر تلملا رہا تھا۔ اپنے آپ پر غصہ کرتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ "ہم خوف کھانے والوں پر بڑے مزے سے حکومت کر رہے تھے۔ کیا معلوم تھا' اک کڑی کی ہوس ہمیں... سر بازار ننگا کر دے گی؟ مجھ سے یہ ذلت برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ پر کس کو غصہ دکھاؤں؟ بھول تو مجھ سے ہوئی ہے۔"

بابے ابلیس نے کہا۔ "تم نے جان کے غلطی نہیں کی ہے۔ ہمیں کیا معلوم تھا' یہ دودھ بیچنے والے اتنے زوردار ہیں؟ ان کے پاس اسلحہ بھی ہے۔"

بشارت نے کہا۔ "آج ان کی طاقت کا اندازہ ہوا ہے۔ ہم ان کی ٹکر پر کمزور نہیں ہیں۔ انہوں نے اچانک گھیر لیا تھا اس لیے مات کھا گئے۔ اگلی واری وہ منہ کی کھائیں گے۔"

اس رات وہ خوب پیتے رہے اور غالب آنے والوں کے خلاف بولتے رہے۔ انہیں چیلنج کرتے رہے پھر نشے سے مغلوب ہو کر گہری نیند میں ڈوب گئے۔ دوسرے دن وہ چاروں بجھے بجھے سے رہے۔ چپ چاپ اپنے دھندے سے لگے رہے۔ شام کو تیمور نے کہا۔ "سردارا! ایک بات معلوم ہوئی ہے۔ وہ دین محمد جو، سیالکوں کی مرمت کرتا ہے۔ اسے جانتے ہو نا؟"

"نہیں جانتا تو جان لوں گا۔ بات کیا ہے؟"

"تم نے اس کی دھی نجو کو دیکھا تھا اور کہا تھا' کسی دن اسے پار لگائیں گے۔"

وہ جھنجھلانے کے انداز میں بولا۔ "مجھ سے کڑیوں کی باتیں نہ کر۔ ابھی ایک ہی بات دماغ میں پک رہی ہے۔ انتقام... صرف انتقام... مجھے اپنی ذلت کا بدلہ لینا ہے۔"

"بدلہ لینے کی ہی بات کر رہا ہوں۔ بشریٰ کے بھائی طارق نے دوبار ہمارا سر نیچا کیا ہے۔ نجو اس کی معشوق ہے۔"

سردارا نے چونک کر پوچھا۔ "تو کیسے جانتا ہے؟"

"ہمارے ڈیرے میں کتنی ہی آتی جاتی رہتی ہیں۔ ان میں سے ایک نے بتایا ہے۔ طارق، نجو سے بیاہ رچانا چاہتا ہے۔ پر اس کا باپ سلامت علی اپنی برادری میں سے کسی کو اپنی نوں بنانے کی ضد کر رہا ہے۔"

سردارا اس کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ تیمور نے کہا۔ "یہ اندر کی بات ہے۔ باپ اور بیٹے میں اختلاف ہے۔ وہ دونوں نجو کے معاملے میں لڑتے رہتے ہیں۔"

وہ مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "ہوں... بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ ہم چاہیں تو باپ بیٹے کو ایک دوسرے کا دشمن بنا سکتے ہیں۔"

"یہی بات میرے دماغ میں بھی ہے۔ پر ان کی دشمنی پکی کیسے ہوگی؟ کچھ ایسی تدبیر کرو کہ وہ اندر سے کمزور ہو جائیں۔"

بابے ابلیس نے کہا۔ "میری کھوپڑی کہتی ہے' نجو کو چک لو۔ نہیں مار کے پھینک دو۔ الزام سلامت علی پر آئے گا تو بیٹا آپ ہی اپنے پیو کا دشمن بن جائے گا۔"

بشارت نے پوچھا۔ "نجو کو مار کر پھینکیں گے تو الزام سلامت علی پر کیسے آئے گا؟"

بابے نے سر سہلاتے ہوئے کہا۔ "ابھی یہاں کچا ایڈیا

ہے۔ اسے پکانا ہوگا۔"

"کامرانی صاحب نے سختی سے تاکید کی ہے ہمیں کبھی کسی قتل کے کیس میں نہیں پھنسنا چاہیے۔ نجو کو مار کر پھینکنے والی بات نہ کرو۔ ہاں۔ اسے اٹھوانے والی بات دل کو لگ رہی ہے۔"

"اسے اس طرح اغوا کرنا ہوگا کہ ہم پر کوئی الزام نہ آئے۔"

"یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ہم دوسرے علاقے کے بدمعاشوں کی مٹھیاں گرم کریں گے تو یہ کام ہو جائے گا۔ پر نجو کو مرنا نہیں چاہیے۔"

باپ نے کہا۔ "ہم اس معاملے میں جلدی نہ کریں۔ آرام نال ایسی کھچڑی پکائیں جسے کھانے کے بعد بدہضمی نہ ہو۔"

انہیں دشمنوں کی طاقت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ عجلت سے کام نہیں لے رہے تھے۔ خوب سوچ سمجھ کر منصوبہ بنا رہے تھے۔ پھر مطمئن ہونے کے بعد اپنے منصوبے پر عمل کرنا چاہتے تھے۔

دوسرے دن شوکت جلال الدین اکبر علی کامرانی اسلام آباد سے واپس آ گیا۔ اسکول میں عید میلادالنبی ﷺ کا جلسہ تھا۔ صدارت کے لیے اس علاقے کے منسٹر سے درخواست کی گئی تھی۔ اسی شام سردارا نے اس کی چوکھٹ پر حاضری دی۔ وہاں تھانے دار سلطان بگا منسٹر صاحب کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ وہ بھی سلام کر کے ایک طرف دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

شوکت علی کامرانی نے پوچھا۔ "یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ اس ٹاؤن کے گبھروں نے تیرے غبارے سے ہوا نکال دی ہے؟"

وہ بولا۔ "جناب! میں نے بگا صاحب کے سمجھانے پر سوچ لیا تھا' ان کے منہ نہیں لگوں گا۔ پر وہ اچانک ہی مجھ پر چڑھ دوڑے۔ مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اگر میں پہلے سے ہشیار ہوتا تو اُن کے غبارے سے پھونک نکال دیتا۔"

بگا نے کہا۔ "میں نے انہیں تنبیہ کی ہے وہ آئندہ سرِعام اسلحے کی نمائش نہیں کریں گے اور نہ ہی سردارا کو للکاریں گے۔"

شوکت علی کامرانی نے بگا سے کہا۔ "تم نے بظاہر معاملہ ٹھنڈا کر لیا ہے۔ پر میرے علاقے میں سردارا کی دہشت طاری نہیں رہے گی تو سب ہی سر چڑھ کے بولنے لگیں گے۔ ہمیں ایسا کچھ کرنا ہے کہ وہ عمر بھر سر جھکا کے رہیں یا پریشان ہو کر گھبرا کر ادھر سے چلے جائیں۔"

وہ شاہانہ طرز کی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "جب تک ساری طاقت ہمارے پاس نہ ہو اور ساری کمزوریاں عوام میں نہ ہوں تو حکومت مستحکم نہیں ہوتی۔ حکمرانی کا پہلا اصول یہی ہے کہ کسی کو بھی سر اٹھانے سے پہلے کچل دیا جائے۔"

سلطان بگا نے کہا۔ "ان دودھ والوں کا کام یہاں خوب جما ہوا ہے۔ انہیں یہاں سے اکھاڑنا مشکل ہوگا۔"

"ہم سیاست دانوں کے لیے کوئی بات مشکل تو ہوتی ہے پر ناممکن نہیں ہوتی۔ میں کل ہی یہ اعلان کراؤں گا کہ دودھ بائیس روپے کلو نہیں پندرہ روپے کلو فروخت کیا جائے۔ اس طرح انہیں کاروبار میں خسارہ ہوگا۔ وہ مسائل سے دوچار ہوں گے۔ پر دودھ سستا ہوگا تو مجھے عوام کی حمایت حاصل ہوگی۔"

بگا نے کہا۔ "بے شک! یہ زبردست سیاسی مار ہوگی۔ وہ احتجاج کریں گے۔ پورے ٹاؤن میں دودھ کی سپلائی بند کر دیں گے۔"

"اپنے سپاہیوں کے ساتھ تیار رہو۔ وہ دودھ بیچنے والے قانون کو ہاتھ میں لیں گے تو میں آئی جی آف پولیس کو حکم دوں گا۔ یہاں کافی تعداد میں پولیس فورس آ کر حالات کو کنٹرول کرے گی۔"

سردارا نے کہا۔ "یہ آپ کی طرف سے بڑے پیمانے پر زبردست حملہ ہوگا۔ وہ لوگ سنبھلنے کی کوشش کریں گے۔ پر میری طرف سے بھی بدمعاشی ہوگی تو ان کے قدم یہاں سے اکھڑ جائیں گے یا پھر وہ ہمارے مقابل کمزور بن کر رہا کریں گے۔"

"تمہاری بدمعاشی تو اُس کُڑی بشریٰ کے لیے ہوگی۔"

اس نے انکار میں سر ہلا کر طارق اور نجو کے معشوقے کے متعلق بتایا۔ ان کے خلاف اپنے منصوبے کا ذکر کیا کہ باپ اور بیٹے کے درمیان اختلافات کی آگ کو بھڑکانے اور انہیں اندر سے کمزور بنانے کے لیے آئندہ کیا کرنا چاہتا ہے؟

شوکت علی کامرانی نے کہا۔ "ان پر ہر طرف سے حملے ہوتے رہیں گے تو وہ جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گے۔ میں اپنے علاقے میں کسی کو سر اٹھا کر بولنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

سردارا وہاں سے واپسی پر سلطان بگا کے ساتھ دیر تک رہا۔ ان کے درمیان یہ طے پایا کہ نجو کو اغوا کرنے کے لیے شہر سے غنڈوں کو بلایا جائے گا۔ ایسے وقت سردارا اپنے خاص حواریوں کے ساتھ ان گبھروں کی نظروں میں رہے گا تاکہ اس پر کسی طرح کا شبہ نہ کیا جائے۔

دوسرے دن شوکت علی کامرانی جشن عید میلادالنبی ﷺ کے سلسلے میں اپنے سیکیورٹی گارڈز کے ساتھ اسکول [illegible] وہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اسے اسٹیج پر [illegible] گیا۔ طلباء و طالبات کے درمیان نعت خوانی اور تقاریر [illegible] تھا۔ شوکت علی نے وہاں پہلی بار بشریٰ کو دیکھا۔ وہ [illegible] اور پُرکشش تھی۔ اس نے حسن و شباب کے [illegible] دیکھے تھے لیکن بشریٰ کی ذہانت اور صلاحیتیں [illegible] کہ وہ اسے دیکھ رہا تھا اور متاثر ہو رہا تھا۔

جب وہ نعت پڑھنے اسٹیج پر آئی تو اس کی مترنم آواز نے [illegible] گہرا اثر کیا۔ اس نے تقریر کرنے کے دوران موجودہ [illegible] بدترین سیاسی حالات کا موازنہ حضرت محمد ﷺ کے [illegible] اور معاشرتی دور سے کیا۔ تمام حاضرین و سامعین واہ واہ [illegible] رہے اور وہ شوکت علی کامرانی کے دل و دماغ میں [illegible] ہو رہی۔

تقریب کے بعد ہیڈ مسٹریس اور تمام اساتذہ نے [illegible] سے کہا کہ وہ بورڈ کے امتحان میں صوبائی سطح پر ٹاپ [illegible] کرے گی اور اول پوزیشن حاصل کرے گی۔ شوکت علی نے [بشریٰ] کو بلا کر اسے قریب سے دیکھا۔ باتوں کے دوران اس کے متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل کیں۔ پھر چپ چاپ دل ہار کر اپنی عالی شان کوٹھی میں آ گیا۔

اس کی ایک بیوی اور دو بچے تھے۔ بیوی تو کچھ زیادہ ہی بیک ورڈ ہو گئی تھی۔ پھر یہ کہ تعلیم یافتہ نہیں تھی۔ وہ اونچی سوسائٹی میں اپنے شانہ بشانہ سیاسی شعور رکھنے والی بشریٰ جیسی [illegible] چاہتا تھا۔ دوسری شادی کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ مگر ادھر یہ رکاوٹ تھی کہ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اس کا [رشتہ] برادری سے باہر نہیں ہو سکتا تھا۔

سیاسی چالبازیاں لوگوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ پھر ان کی برادریاں کیا معنی رکھتی تھیں؟ اقتدار کی قوت کے آگے ساری روایات دم توڑ دیتی ہیں۔

شوکت علی کامرانی کے خیالوں میں شطرنج کی جو بساط بچھی ہوئی تھی، وہاں دو مہرے اہم تھے۔ ایک بشریٰ کا باپ سلامت علی اور دوسرا بشریٰ کا طلب گار سردارا تھا۔۔۔۔

وہ ان دونوں کو مات دے کر اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا۔ ایسے وقت سردارا کی یہ بات دل کو لگ رہی تھی کہ پہلے [باپ] بیٹے کے درمیان پھوٹ ڈالی جائے۔ ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کر کے ہی انہیں کمزور اور اپنا مطیع و فرماں بردار بنایا جا سکے گا۔

اس نے اسی وقت سردارا کو طلب کیا۔ وہ حاضر ہو کر بولا۔ "جی مائی باپ! حکم کریں؟"

اس نے کہا۔ "آج میں نے بشریٰ کو دیکھا ہے۔ آئندہ اسے میلی نظر سے نہ دیکھنا۔ میں اسے شریکِ حیات بنانا چاہتا ہوں۔"

سردارا نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ "میری کیا مجال ہے؟ میں آپ کی پسند کے آگے نظریں جھکا کے رکھوں گا۔ پر آپ جانتے ہیں' وہ اگلے برس اپنی برادری میں بیاہی جانے والی ہے۔"

"جانتا ہوں، اسی لیے تجھے بلایا ہے۔ اس ہونے والی شادی کو خانہ آبادی نہیں۔۔۔ خانہ بربادی ہونا چاہیے۔ تم ان باپ بیٹے کو آپس میں لڑانے کے لیے کیا کر رہے ہو؟"

"تین بدمعاشوں سے ٹکا ٹکا ہو چکا ہے۔ وہ کل رات واردات کریں گے۔ نجو کو اٹھا کے لے جائیں گے۔"

شوکت علی کامرانی خیالی شطرنج کی بساط پر مہروں کو دیکھنے اور سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ "ایسے وقت وہ باپ بیٹے کہاں ہوں گے اور تم سب کہاں رہو گے؟ پہلے سے اپنی اپنی پوزیشن بنا لو۔"

سردارا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ شوکت علی نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکا پھر کہا۔ "کل شام کو بڑے چوک میں عید میلادالنبی ﷺ کا جلسہ کرو۔ اعلان کرو کہ میں اس جلسے میں عوام کے روبرو آؤں گا اور تقریر کروں گا۔ انہیں دودھ سستا کرنے کی خوش خبری سناؤں گا۔"

وہ بولا۔ "بڑی اچھی تدبیر ہے سرکار! ہم سب اس جلسے میں لوگوں کے سامنے موجود رہیں گے تو نجو کے اغوا کا الزام ہم پر نہیں آئے گا۔"

سیاسی چالیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ سانپ بھی مر جاتے ہیں اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی۔ پھر یہ کہ دودھ سستا ہونے کے بعد لاٹھی والوں کو زندہ باد کہا جانے والا تھا۔ یہ بھی طے پایا گیا کہ صرف دودھ میں ہی نہیں۔۔۔ آٹا' چاول اور دالوں کی قیمتوں میں بھی فی کلو ایک روپے کی کمی کی جائے گی اور بڑے بڑے مہاجنوں کا خسارہ پورا کرنے کے لیے انہیں ملاوٹ کی اجازت دی جائے گی۔ اس طرح مہاجن خوش رہیں گے اور لوگ ہمیشہ کی طرح اُلو بنتے رہیں گے۔

☆☆☆

نجو آٹا گوندھ رہی تھی۔ ماں چولہے کے پاس سالن پکا رہی تھی۔ چھوٹا بھائی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے نعت خوانی سنائی دے رہی تھی۔ اس ٹاؤن کے تقریباً سب ہی مرد وہاں کے جاگیردار اور منسٹر کی تقریر سننے کے لیے جلسے میں گئے تھے۔ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ آج انہیں بہت بڑی خوش خبری سنائی جائے گی۔ اس قوم کو بھی کوئی

خوش خبری نہیں ملتی۔ پھر بھی وہ سننے گئے تھے۔

چونکہ جلسہ گاہ کو رنگ برنگے قمقموں سے اور تیز روشنیوں سے منور کیا گیا تھا، اس لیے مضافاتی بستیوں میں لوڈشیڈنگ کی گئی تھی۔ وہاں کے دوسرے گھروں کی طرح نجو کے گھر میں بھی لالٹین کی پیلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر دور تک تاریکی تھی۔ ایسی تاریکی میں چار افراد منہ پر ڈھاٹا باندھے اندر چلے آئے۔ ان تینوں کو ریوالور کے نشانے پر رکھتے ہوئے دھمکی دی۔ "کوئی بھی منہ سے آواز نکالے گا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔ چپ رہو گے تو زندہ رہو گے۔"

ماں سہم کر ہاتھ جوڑتی ہوئی ایک کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ چھوٹا بھائی خوف سے چپ تھا۔ ایک نے ابا کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے چارپائی پر گرادیا۔ نجو ان کی دھونس میں نہیں آئی۔ اس نے چیخ کر پوچھا۔ "اوئے... کون ہو تم لوگ؟"

وہ آگے نہ کہہ سکی۔ ریوالور کا دستہ منہ پر پڑا تھا۔ اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ پیچھے سے ایک شخص نے گردن دبوچ لی۔ دوسرے نے جبراً اس کا منہ کھول کر ایک کپڑا ٹھونس دیا۔ اس کی ماں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ دو افراد نجو کو اٹھا کر ایک کمرے میں لے آئے۔ وہ قابو میں نہیں آرہی تھی۔ جب اسے چارپائی پر ڈال کر اچھی طرح پٹائی کی گئی تو وہ نیم مردہ سی ہوگئی۔

ایک نے اس کا لباس پھاڑتے ہوئے کہا۔ "سالی! گھروں کے گھرانے میں بہو بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ آج کے بعد کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔"

باہر آنگن میں ایک شخص اس کی ماں سے کہہ رہا تھا۔ "بیٹا تیری دھی کو بیوی بنانا چاہتا ہے۔ سسر کو بہو پسند نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے آج کے بعد باپ بیٹے کا جھگڑا ہی مک جائے۔"

وہ چاروں جلدی میں تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے نجو کی عزت کا کباڑا کردیا۔ پھر کمرے میں رکھی ہوئی قینچی سے اس کے بال کاٹ کر فرار ہوگئے۔ اس تاریکی میں انہیں نہ کسی نے آتے دیکھا اور نہ جاتے۔ وہ ایسی وارداتیں کرنے میں ماہر تھے۔ اپنی مہارت دکھا چکے تھے۔

ماں بیٹے بڑی دیر تک آنگن میں چارپائیوں پر پڑے رہے۔ جب یقین ہوگیا کہ دشمن جاچکے ہیں تو ماں اٹھ کر بیٹے کے پاس آئی۔ دونوں کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ کھولے۔ منہ سے کپڑا نکالا۔ پھر تیزی سے چلتے ہوئے کمرے میں آئے۔ وہاں نجو کو دیکھتے ہی ماں کے حلق سے دکھ بھری چیخ نکلی۔ اس نے بیٹے کا منہ دوسری طرف پھیر دیا۔

پہنا ہوا لباس بھی اس کے بدن پر نہیں تھا۔ وہ لہولہان تھی۔ دونوں ہاتھ چارپائی سے بندھے ہوئے تھے۔ اس پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ بوڑھی ماں نے بیٹے سے کہا۔ "جلدی سے جا۔ اپنے ابے کو بول... یہاں قیامت آگئی ہے۔"

وہ دوڑتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وہ بیٹی کا بدن صاف کرکے دوسرا لباس پہنانے لگی۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ پھر باہر آکر محلے پڑوس والوں کو آوازیں دینے لگی۔ ذرا سی دیر میں وہاں عورتیں جمع ہوگئیں۔ نجو پہچانی نہیں جارہی تھی۔ اس کی لانبی چوٹی کٹ چکی تھی۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال کانٹوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر زخموں کے نشان کہہ رہے تھے کہ بڑی بے دردی سے اس پر مظالم ڈھائے گئے ہیں۔

بیٹے نے جلسے میں آکر باپ کو بتایا کہ گھر میں ڈاکو آئے تھے۔ پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا۔ "سائیکلیں مرمت کرنے والے کے گھر میں کون سا خزانہ دبا ہوتا ہے کہ ڈاکو لینے آئیں گے؟"

دین محمد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جوان دھی رانیاں کسی خزانے سے کم نہیں ہوتیں۔ یہ نہ بھولو کہ آس پاس کی بستیوں سے اب تک چار لڑکیوں کو اغوا کیا جاچکا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ ضرور کوئی رپھڑ ہے۔"

اس وقت شوکت علی کامرانی تقریر کررہا تھا اور مسائل کم کرنے کی باتیں کررہا تھا۔ لوگوں کی دلچسپیاں بڑھ رہی تھیں۔ ایسے میں انہوں نے دین محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوئے! چپ کر... منسٹر صاب کو بولنے دے۔"

ایسے وقت کتنے ہی گجر دودھ کی قیمت گرانے کے سلسلے میں احتجاجاً کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ مسلح سپاہی آگے بڑھ کر انہیں چپ رہنے یا وہاں سے جانے کا حکم دے رہے تھے۔

طارق، دین محمد اور اس کے بیٹے کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ شوکت علی، سلطان بگا، سردارا اور اس کے حواریوں نے طارق کو ان کے ساتھ جاتے دیکھا تو سمجھ گئے کہ کام ہوچکا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہی طارق اور دین محمد نے جلسے میں آکر شوکت علی کامرانی کے سامنے دہائی دی۔ چیخ چیخ کر بتایا کہ دین محمد کے گھر میں ابھی چار ڈاکو آئے تھے۔ انہوں نے اس کی بیٹی نجو کو تباہ و برباد کردیا ہے۔

شوکت علی نے مائیک کے سامنے آکر بڑے جذبے سے کہا۔ "نجو ہم سب کی بہن اور بیٹی ہے۔ ہم مجرموں کو فرار نہیں ہونے دیں گے۔ میں سلطان بگا کو حکم دیتا ہوں کہ وہ فوراً مجرموں کا سراغ لگائے۔"

سلطان بگا کئی مسلح سپاہیوں کے ساتھ مستعدی دکھانے کے لیے وہاں سے جاتے ہوئے بولا۔ "پہلے نجو کا بیان لینا ہوگا۔ وہ بتائے گی کہ آنے والے کون تھے اور کس حلیے میں تھے؟"

پولیس والوں کے ساتھ دیگر افراد بھی قافلے کی صورت میں وہاں چلے آئے۔ نجو کی حالت افسوس ناک تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے کانٹے دار بال ایسے تھے کہ وہ ایک اجڑی ہوئی پاگل سی لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ بُری طرح لٹنے کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ وہ ایک ایک کو گھور کر دیکھ رہی تھی جیسے دشمنوں کو ڈھونڈ رہی ہو۔ پھر اس کی گھومتی ہوئی نظریں سلامت علی پر آکر ٹھہر گئیں۔

سلامت علی نے ایک بار اس سے کہا تھا۔ "میرے پتر کا پیچھا چھوڑ دے۔ تُو میرے گھر میں کبھی بہو بن کر نہیں آسکے گی۔"

سلطان بگا نے پوچھا۔ "تم نے ان لٹیروں کی صورت دیکھی ہوگی۔ مجھے ان کا حلیہ بتاؤ؟"

نجو نے پھر سلامت علی کو گھور کر دیکھا۔ وہ پریشان ہوکر بولا۔ "مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہے؟"

طارق نے کہا۔ "نجو! حوصلہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تھانے دار کی باتوں کا جواب دو۔"

اس کی نظریں بدستور سلامت علی پر جمی ہوئی تھیں۔ سلطان بگا نے اس کی ماں سے پوچھا۔ "تم نے ان لوگوں کو دیکھا ہوگا؟"

ماں نے روتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے منہ پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا تھا کہ بیٹا تیری دھی کو ووہٹی بنانا چاہتا ہے۔ سسر کو بہو پسند نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے آج کے بعد باپ بیٹے کا جھگڑا ہی مک جائے۔"

سلامت علی نے غصے سے کہا۔ "یہ کیا بکواس کررہی ہو؟ ہم باپ بیٹے کا اپنا معاملہ ہے۔ وہ ڈاکو ایسی بات..."

سلطان بگا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ "بکواس تم کررہے ہو۔ اس عورت کو بیان دینے سے روک رہے ہو۔ یہاں سے باہر جاؤ۔ اپنے بیٹے کو بھی لے جاؤ۔ میں پہلے ماں بیٹی کا بیان لکھوں گا۔ یہ اپنے انگوٹھوں کے نشان لگائیں گی، اس کے بعد تمہارا محاسبہ کیا جائے گا۔"

طارق اپنے باپ کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ابا... باہر چلو۔"

پھر وہ نجو سے بولا۔ "میں باہر ہوں۔ وہی بیان دو جو سچ ہے۔ کسی سے نہ ڈرو۔ میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ باہر آیا تو باپ نے کہا۔ ''دیکھ... ابالیو! میں شبہ نہ کر۔ اس کی عزت لٹ چکی ہے۔ وہ تیری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے میرے خلاف بول رہی ہے۔''

طارق نے کہا۔ ''وہ تو چپ ہے۔ اس نے تمہارے خلاف کچھ نہیں کہا ہے۔''

''اس کی ماں تو کہہ رہی ہے۔ وہ ہمیں آپس میں لڑا کر اپنی دھی کو تیرے گلے میں ڈھولک کی طرح لٹکانا چاہتی ہے۔ عقل سے کام لے۔ اب وہ ڈھول کا پول ہو گئی ہے۔''

''اور تم جو چاہتے تھے وہ ہو گیا ہے۔''

''بکواس نہ کر۔ میں ایسا کچھ نہیں چاہتا تھا۔ میری بھی جوان بیٹی ہے۔ میں سوہنے رب سے ڈرتا ہوں۔''

''سب ہی خدا سے ڈرتے ہیں۔ پر گناہ کرتے وقت سارا ڈر دل سے نکل جاتا ہے۔''

''او، کھوتے دیا پتر! اکس عقل سے سمجھ رہا ہے کہ یہ گناہ میں نے کیا ہے؟''

''تم نے ایک دن کہا تھا' میں نجو کے خیال سے باز نہ آیا تو تم اسے بازار میں پہنچا دو گے۔''

''وہ تو میں نے غصے سے کہا تھا۔''

''یہ بھی تم نے غصے سے ہی کیا ہے... یعنی کہ کرایا ہے۔ یہ بات چھپنے والی نہیں ہے۔ سچ سچ بتا دو' وہ کون لوگ تھے؟''

سلامت علی نے اچانک ہی ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''لعنت ہے تجھ پر... دور ہو جا میری نظروں سے... نہیں تو میں تیرا گلا دبا دوں گا...''

''دیکھو ابا! باپ بن کر مارو گے تو سر جھکا تا رہوں گا۔ پر آگے جا کے یہ ثابت ہو گا کہ میری نجو کو تم نے برباد کرایا ہے تو میں رشتہ بھول جاؤں گا۔ پھر پتا نہیں' کیا کر بیٹھوں گا؟''

''ارے... ! جا دفع ہو جا... میں نے اس لڑکی سے کوئی دشمنی نہیں کی ہے۔ پر میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے۔ اب وہ چھوٹی ہانڈی میرے ویڑے میں نہیں آئے گی۔''

سلطان بگا نے باہر آ کر کہا۔ ''ماں بیٹی نے جو بیان دیا ہے' اس کے مطابق واقعی تمہارے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہوتی۔''

پھر اس نے سپاہیوں سے کہا۔ ''اسے ہتھکڑی لگاؤ اور تھانے لے جاؤ۔ وہاں اس کا بیان لیا جائے گا۔''

طارق نے پریشان ہو کر کہا۔ ''ابا کو ہتھکڑی نہ لگاؤ۔ میں اس سے سچ اگلوا رہا ہوں۔ رب دی سوں... نجو سے ناانصافی نہیں ہونے دوں گا۔''

وہ بولا۔ ''مجھے قانونی کارروائی کرنے دو۔ قانون کی مدد کرنا چاہتے ہو تو تھانے آ کر باپ کو سچ بولنے پر مجبور کرو۔''

چار سپاہی سلامت علی کو ہتھکڑیاں پہنا کر لے جانے لگے۔ طارق تذبذب میں پڑ گیا کہ ایسے وقت کیا کرے؟ باپ کے پیچھے جائے یا محبوبہ کی دل جوئی کرے؟ وہ بُری طرح لٹ چکی تھی۔ ظالموں نے سر کے بال کاٹ کر مزید تماشا بنا دیا تھا۔

بگا نے کہا۔ ''مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ معشوق کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ہے اور باپ کو تم عدالت کی سزا سے بچا نہیں سکو گے۔ میں کامرانی صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔ اپنی کارکردگی دکھاؤں گا کہ چٹکی بجاتے ہی مجرم شکنجے میں آ گیا ہے۔''

وہ وہاں سے اپنی جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ طارق اپنے باپ کو ناراضی ضرور دکھا رہا تھا مگر یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ اسے عدالت سے سزا سنائی جائے۔ یوں اس کا پورا خاندان بدنام ہونے والا تھا۔ باپ نے کوئی جرم کیا ہو یا نہ کیا ہو... فی الحال اسے تھانے کچہری کے چکر سے نکالنا ضروری تھا۔

اور باپ کو الزام سے بچانا کچھ مشکل نہ تھا۔ نجو اور اس کی ماں کا بیان بدل دیا جاتا۔ عارضی طور پر سمجھوتا ہو جاتا تو بازی پلٹ سکتی تھی۔ پھر بعد میں وہ باپ کا محاسبہ کرتا۔ وہ سوچتا ہوا دروازہ کھول کر اس کمرے میں آیا جہاں نجو والدین کے سامنے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے طارق کو دیکھتے ہی دوپٹے میں منہ چھپا لیا۔ اب وہ فخر کرنے والا منہ نہیں رہا تھا کہ میں صرف تمہارے لیے کنواری ہوں۔ کسی نے اب تک مجھے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔

اس کا یہ مان، یہ خودداری اور انا مر چکی تھی۔ طارق کے آتے ہی بوڑھے ماں باپ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہ چارپائی کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اب تک تمہیں روتے نہیں دیکھا ہے۔ تم بہت حوصلے والی ہو۔ میں تمہارے مزاج کو سمجھتا ہوں۔ تمہیں ان ظالموں پر غصہ آ رہا ہو گا۔ تم ان پر تھوک دینے اور انہیں مار ڈالنے کے لیے سوچ رہی ہو گی۔ یقین کرو' تم ایسا ضرور کرو گی۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔''

وہ بولی۔ ''اب میں تمہارے قابل نہیں رہی۔ مجھ سے محبت نہ کرو۔ صرف ہمدردی کرو۔ صرف اتنا کرو کہ میں ظالموں کو اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھ سکوں۔''

''میں ان دشمنوں کو سزا سے بچنے نہیں دوں گا۔ تم میرے لیے پہلے جیسی ہو۔ میں تمہیں اپنی شریکِ حیات ضرور بناؤں گا۔''

''جوش میں آ کر نہ بولو۔ تمہاری برادری والے مجھے قبول نہیں کریں گے۔ مجھ سے بیاہ کی بات نہ کرو۔ صرف یہ بتاؤ کہ انتقام کس سے لو گے اور کب لو گے؟''

وہ اس کی طرف منہ اٹھا کر بول رہی تھی۔ چہرہ دوپٹے میں چھپا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اسے تو ہٹاؤ۔''

وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''نہیں۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ انتقام کس سے لو گے؟''

''ابھی کیسے کہہ سکتا ہوں؟ پہلے گناہ گار کا سراغ تو لگانے دو۔''

''سراغ مل گیا ہے۔ میں اس کے خلاف بیان دے چکی ہوں۔''

''دیکھو نجو! میرے ابا پر شبہ ضرور کرو۔ پر یقین کے ساتھ اپنے بیان پر قائم نہ رہو۔ میں جلد ہی اصل مجرموں کو ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''اگر تمہارے ابا مجرم ثابت ہوئے تو پھر کیا کرو گے؟''

''جیسا تم چاہو گی' اس کے ساتھ ویسا سلوک کیا جائے گا۔''

اس نے دوپٹے کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو میں منہ دکھانے کے قابل رہوں گی۔ فخر کروں گی کہ تم نے میری خاطر باپ کے رشتے کا لحاظ نہیں کیا۔ میرے ساتھ انصاف کیا ہے۔''

وہ وہاں سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی تھانے جا کر ابا سے بات کرتا ہوں۔ اگر اس کا کوئی قصور نہ ہوا تو اس کی حمایت کروں گا۔ اسے قانون کی بے جا گرفت سے نکالنا میرا فرض ہے۔''

وہ وہاں سے سیدھا تھانے پہنچا۔ بشریٰ کا منگیتر دارا شکوہ بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے کہا۔ ''یار طارق! تیری مت ماری گئی ہے؟ ابا جی پر شبہ کر رہا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''نجو اور اس کی ماں کا بیان ایسا ہے کہ سب ہی شبہ کریں گے۔ میں ابا سے حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ پر اس کا دماغ تو ہمیشہ چوتھے پر چڑھا رہتا ہے۔ وہ سیدھے منہ بات نہیں کر رہا ہے۔''

''میں نے بات کی ہے۔ اس نے غنڈوں سے ایسی کوئی واردات نہیں کرائی ہے۔ وہ ماں بیٹی جھوٹ بول رہی ہیں۔''

''میں نہیں مانتا... وہ جھوٹ کیوں بولیں گی؟''

''اس لیے کہ سلامت چاچا اسے اپنی بہو بنانے سے انکار کرتے آ رہے ہیں۔ اب وہ باپ بیٹے میں جھگڑا بڑھا رہی ہیں۔''

سلامت علی آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے بیٹے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''یہ بات

اس کھوتے کی عقل میں نہیں آئے گی۔ وہ کُڑی اس کی نظروں میں چڑھی ہے اور یہ باپ جھوٹا ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے ابا! وہ جھوٹی ہے یا سچی... یہ بعد میں معلوم ہو گا۔ ابھی ہم سب کے لیے شرم کی بات یہ ہے کہ ایک شریف لڑکی کی عزت لوٹی گئی ہے۔ میری بہن بشریٰ جوان ہے۔ خدانخواستہ اس کے ساتھ ایسا ہوتا تو ہم خون کی ندیاں بہا دیتے۔ کیا میں نجو کے معاملے میں اس لیے چپ رہوں کہ وہ ایک غریب سیکل والے کی دھی ہے؟''

دارا شکوہ نے کہا۔ ''ہم اس کے مجرموں کو ڈھونڈنے کے لیے پولیس والوں کی مدد کریں گے۔''

''جب انہیں ڈھونڈ لیں گے اور گرفتار کریں گے تو اصل مجرموں کے سامنے ابا کی بے گناہی ثابت ہو جائے گی۔''

دارا شکوہ نے اپنے سسر سلامت علی کی جانب دیکھا۔ پھر کہا۔ ''یہ درست کہتا ہے۔ اصل مجرم سامنے آئیں گے تو ماں بیٹی کا بیان غلط ہو جائے گا۔ ہم ان مجرموں تک پہنچنے کے لیے جی جان سے کوششیں کرتے رہیں گے۔''

سلامت نے سلاخوں کے پیچھے سے کہا۔ ''کوششیں کرتے رہنا۔ پہلے مجھے یہاں سے تو نکالو۔''

''ہم تھانے دار کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ آئیں گے تو رہائی ملے گی۔''

مگر آسانی سے رہائی ملنے والی نہیں تھی۔ تھانے دار بڑے صاحب شوکت علی کامرانی کے دربار میں حاضر تھا۔ نجو کے سلسلے میں جو واردات ہوئی تھی' اس کی تفصیلی رپورٹ پیش کر رہا تھا۔ شوکت علی نے خوش ہو کر کہا۔ ''ان تمام معاملات میں یہ بات میرے مطلب کی ہے کہ سلامت علی پر الزام آیا ہے اور وہ تمہاری حراست میں ہے۔ اس الزام کو کمزور نہیں ہونا چاہیے۔''

''ہم تابع دار ہیں۔ اس الزام کو ہر پہلو سے مضبوط کرتے رہیں گے۔''

''اور میں بشریٰ تک پہنچنے کے لیے اس ملزم باپ سے ہمدردی کرتا رہوں گا۔ پہلے اسے گردن تک دلدل میں

دھندا کروں گا۔ پھر نکالوں گا تو وہ راضی خوشی مجھے اپنا جنوائی بنائے گا۔"

"ابھی اس کے رشتے دار رہائی دلوانے تھانے آئیں گے۔ جب تک عدالت سے ضمانت نامہ حاصل نہیں کیا جائے گا، میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟"

"اصولاً تو یہی ہونا چاہیے۔ اگر وہ لوگ رہائی کے لیے تھانے آئیں تو مجھے اطلاع دو۔ میں خود وہاں آؤں گا۔ اس طرح سلامت علی متاثر ہوگا اور میرا احسان مند رہے گا۔"

سلطان بگا تھانے آیا تو طارق اور دارا شکوہ وہاں موجود تھے۔ انہوں نے سلامت کی رہائی کے لیے التجا کی۔ اس نے کہا۔ "تمہارے ساتھ شرمناک ظلم ہوا ہے۔ اس نے اور اس کی ماں نے مجرموں کو دیکھا ہے۔ ان کی باتیں سنی ہیں۔ ماں بیٹی کے بیانات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ کوئی بڑا معتبر شخص ضمانت دے گا تو سلامت علی کو رہائی ملے گی۔ پھر یہ کیس عدالت میں ضرور پہنچے گا۔"

دارا شکوہ نے کہا۔ "پورے ٹاؤن میں ہم معتبر سمجھے جاتے ہیں۔ ابھی ہزاروں لاکھوں روپے کی ضمانت دیں گے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "سلامت علی تمہارا رشتے دار ہے۔ اس کے خلاف جرم ثابت ہوگا تو تم اسے فرار ہونے کا موقع دو گے۔ تم گھروں کی ضمانت منظور نہیں کی جائے گی۔"

اس بات پر بحث ہونے لگی۔ بگا نے کہا۔ "میں شوکت صاحب سے بات کرتا ہوں۔ وہی شاید اس سلسلے میں کچھ کر سکیں گے۔"

دارا شکوہ نے ناگواری سے کہا۔ "وہ ہمارے لیے کچھ نہیں کریں گے۔ انہوں نے دودھ کی قیمت گرا کے جو نقصان پہنچایا ہے، اسے ہم کبھی نہیں بھلا سکتے۔"

بگا نے کہا۔ "یہاں ان کے خلاف نہ بولو۔ کام کی بات کرو۔ اسے ضمانت پر لے جانا چاہتے ہو یا نہیں؟"

طارق نے کہا۔ "ہم ابا کی رہائی چاہتے ہیں۔ آپ ہمارے لیے کچھ کریں۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر تھانے کے دوسرے حصے میں آ گیا۔ وہاں فون پر شوکت علی کو اطلاع دی۔ وہ آدھے گھنٹے کے اندر سکیورٹی گارڈز کے ساتھ تھانے پہنچا تو سب ہی الرٹ ہو گئے۔ طارق اور دارا شکوہ بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تھانے دار نے آگے بڑھ کر جھکتے ہوئے کہا۔ "معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو یہاں آنے کی زحمت دی ہے۔ بات یہ ہے کہ..."

وہ ڈانٹ کر بولا۔ "بکواس بند کرو۔ تم نے سلامت علی جیسے معزز شخص کو حوالات میں رکھا ہے۔ انہیں فوراً باہر نکالو۔"

ایک سپاہی نے دوڑ کر لاک اپ کا دروازہ کھول دیا۔ شوکت علی کامرانی نے آگے بڑھ کر سلامت علی سے مصافحہ کرتے ہوئے بڑے ادب سے کہا۔ "آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ یہ جو زیادتی ہوئی ہے، اس کے لیے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔"

سلامت علی نے سر جھکا کر کہا۔ "آپ جی! شرمندہ نہ کریں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ جیسی عظیم ہستی میری عزت افزائی کے لیے تھانے چلی آئے گی۔"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میں آپ کا مقدمہ لڑنے کے لیے عدالت میں بھی حاضری دوں گا۔ مجھے بگا نے بتایا ہے، معاملہ بہت سنگین ہے۔ آپ بری طرح پھنسنے والے ہیں۔ ویسے اطمینان رکھیں اور مجھ سے ملتے رہیں۔ میں پوری کوشش کروں گا۔ آپ کو کسی بھی جھنجٹ سے باعزت طور پر بری کراؤں گا۔ ابھی ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ مجھ سے کسی وقت بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔ ابھی اجازت چاہتا ہوں۔"

سلامت علی اس سے متاثر ہو چکا تھا۔ وہ مصافحہ کر کے اپنے گارڈز کے ساتھ واپس چلا گیا۔ اس نے کسی اور سے بات نہیں کی تھی۔ یہ سلامت علی کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ علاقے کا جاگیردار اور منسٹر اس کی خاطر وہاں آیا تھا اور عارضی طور پر اسے رہائی دلا کر گیا تھا۔

شوکت علی کامرانی نے اپنی کوٹھی میں آ کر سردارا کو بلایا۔ پھر خوش ہو کر کہا۔ "تیری بدمعاشی کا سواد آ گیا۔ سلامت علی ملزم بن گیا ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ اصل مجرم کبھی نظروں میں نہ آئیں۔"

"جناب عالی! وہ کبھی نظروں میں نہیں آئیں گے۔ وہ کراچی چلے گئے ہیں۔ وہاں ان کا دھندا چلتا رہا تو لوٹ کر نہیں آئیں گے۔"

"اب ایک کانٹے کو راستے سے ہٹانا ہے۔ اس کے بعد بشریٰ تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔"

"سمجھ گیا سرکار! اس کا بھائی طارق رکاوٹ ہے۔"

"طارق تو اپنی محبوبہ کا ماتم کرتا رہے گا اور اپنے باپ سے جھگڑتا رہے گا۔ اصل کانٹا دارا شکوہ ہے۔ وہ ختم ہوگا تو بشریٰ اس کی منگ نہیں رہے گی۔ پھر میں رشتے کی بات چلاؤں گا۔"

"سمجھ گیا جناب عالی! وہ نشانے پر آئے گا تو ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لے سکے گا۔"

وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ "واردات علاقے [illegible] ... چاہیے۔ مجھ پر کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے۔"

"[illegible] والا کوئی کام نہیں کروں گا۔ وہ بیٹھے [illegible] کی لاش اٹھا دی جاتی ہے۔ اس واردات جائے گا تو [illegible] گا۔"

ایک وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شوکت علی نے ریسیور اٹھایا [illegible] سردارا سے کہا۔ "ڈی آئی جی کی کال ہے۔ [illegible] خاموش رہنا۔"

اس نے ریسیور کو اٹھا کر کان سے لگایا۔ "ہیلو! میں [illegible] شوکت علی کامرانی..."

"سر! یہ اینٹی نارکوٹکس والے پھر انکوائری شروع [illegible] ہیں۔"

"وہ میرے علاقے سے نشے کی ایک پڑیا بھی برآمد نہ کر سکے۔ اگر دوبارہ آتے ہیں تو آنے دو۔ پھر ناکام ہو کر جائیں گے۔"

"اس بار سی آئی اے کا ایک انسپکٹر فرمان اکبر اپنی ٹیم کے ساتھ آ رہا ہے۔"

"اس کے بارے میں کچھ بتاؤ؟"

"وہ لاہور سے آ رہا ہے۔ اس کے متعلق سنا ہے بہت ہی ہوشیار اور چالباز ہے۔ اس کا سروس ریکارڈ بے داغ ہے۔ وہ رشوت دینے والوں کو دوڑا دوڑا کر مارتا ہے۔"

"ہوں... کب تک آ رہا ہے؟"

"مجھے دیر سے اطلاع ملی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ وہاں پہنچ گیا ہو۔ یا آج کل میں آنے والا ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دیکھوں گا وہ کون ہے اور کیا تیر چلانے والا ہے۔"

وہ ریسیور رکھ کر سردارا سے بولا۔ "فوراً سنبھل جاؤ۔ ایک اور مصیبت آ رہی ہے یا شاید آ چکی ہے۔ کیا تم نے سی آئی اے انسپکٹر فرمان اکبر کا نام سنا ہے؟"

"نہ سرکار! نہ سنا ہے نہ اسے دیکھا ہے۔"

"معلوم کرو یہاں حال ہی میں کتنے نئے افراد ہوٹلوں اور کرائے کے مکانوں میں آ کر رہنے لگے ہیں؟ اطلاع کے مطابق وہ بہت چالاک جاسوس ہے۔ اسے ڈھونڈنا اور پہچاننا بہت ضروری ہے۔ ورنہ غفلت میں اپنی گردن پھنسا لوگے۔"

"میں ابھی جا کر معلوم کرتا ہوں۔ کل سویرے تک نئے آنے والوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

وہ کوٹھی سے نکل کر اپنے حواریوں کے ساتھ شوکت آباد کے ایک ایک محلے اور ایک ایک گلی میں جا کر معلومات حاصل کرنے لگا۔ اس نے اپنے کارندوں کو سختی سے حکم دیا کہ جس

فاتح عالم

ارسطو کے ہاں مختلف شہزادے زیرِ تعلیم تھے۔ ایک روز ایک شہزادے سے ارسطو نے سوال کیا۔

"اگر تمہیں بادشاہت ملی تو میری تعلیمی خدمات کا کیا صلہ دو گے؟"

"میں تمام تر مہمات سلطنت میں آپ کے مشورے کو مقدم رکھوں گا۔"

یہی سوال ارسطو نے دوسرے شہزادے سے کیا۔ اس نے جواب دیا۔

"میں آپ کو برابر کا شریک رکھوں گا۔"

جب سکندر کی باری آئی تو اس نے عرض کیا۔

"مجھ سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھا جائے کیونکہ اس کا فاعل حقیقی میں نہیں بلکہ خدا ہے برتر ہوگا۔"

ارسطو اس جواب سے بہت خوش ہوا اور کہا۔ "تیری اس دانائی کا جواب سب پر سبقت لے گیا اور مجھے تیرے اس جواب سے تیرے فاتح عالم ہونے کی خوشبو آئی ہے۔"

کے پاس جتنی بھی چرس اور ہیروئن موجود ہے، انہیں کھیتوں اور کھلیانوں میں چھپا دیا جائے۔ باہر سے آنے والے گاہکوں سے کہہ دیں کہ عارضی طور پر یہ دھندا بند ہو چکا ہے۔

پہلے کئی بار اینٹی نارکوٹکس فورس نے اور پولیس فورس نے اس علاقے میں جگہ جگہ چھاپے مارے تھے۔ سردارا اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا تھا۔ مگر یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ منشیات کا بھاری ذخیرہ کہاں چھپا کر رکھا جاتا ہے؟ ان گرفتار ہونے والوں کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا تو انہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔

چھپ چھپا کر پڑیا بیچنے والے دو چار کارندوں نے گرفتار ہونے کے بعد بیان دیا تھا کہ وہ آس پاس کے شہروں سے تھوڑا تھوڑا مال لا کر فروخت کرتے ہیں۔ ان کی پٹائی کی گئی تھی۔ انہوں نے چار چھ ماہ جیلوں میں گزارے پھر واپس آ کر دھندے سے لگ گئے۔

سردارا نے بڑے بڑے گاہکوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ گاڑیاں لے کر شوکت آباد نہ آئیں۔ آئندہ ان کے شہروں میں مال پہنچا دیا جائے گا۔ اس طرح مختلف شہروں سے گاہکوں کی ریل پیل ختم ہو چکی تھی۔ اس ٹاؤن میں پہلے جیسی چہل پہل نہیں رہی تھی۔ یہی سمجھ میں آ رہا تھا کہ منشیات کا کاروبار وہاں سے کسی دوسرے علاقے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

وہ دوسرا علاقہ کہاں ہے؟ یہ معلوم نہ ہو سکا۔ جب حاکم

اور پولیس والے پشت پناہی کررہے ہوں تو سراغ لگانا ممکن نہیں ہوتا۔

فرمان اکبر نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسران سے کہا۔ ''میں شوکت آباد جاتا آتا رہتا ہوں۔ کبھی دو چار راتیں بھی گزاری ہیں۔ وہاں کے معزز شہری کہتے ہیں کہ اب بھی وہاں پڑیا فروخت ہوتی ہے اور اسی علاقے سے دوسرے شہروں تک مال سپلائی کیا جاتا ہے۔''

فرمان نے ایک عام شہری کی طرح وہاں رہ کر جو معلومات حاصل کی تھیں، اس رپورٹ میں یہ یقین سے کہا گیا کہ سردارا، بشارت، تیمور، بابے ابلیس اور تھانے دار سلطان بگا اس دھندے میں ملوث ہیں۔ مزید یہ کہ سلطان بگا اور سردارا اس علاقے کے جاگیردار اور منسٹر شوکت علی کامرانی کے خاص درباری ہیں۔

وہاں ان کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ معمول کے مطابق پولیس چھاپے مارنے جائیں تو انہیں پہلے سے خبر ہوجاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مجرم گرفتار ہوتے ہیں پھر چھوٹ کر چلے جاتے ہیں۔

یہ رپورٹ پڑھنے کے بعد اعلیٰ افسران نے فرمان اکبر کو اجازت دی تھی کہ وہ اپنے طور پر وہاں رہ کارروائیاں کرسکتا ہے۔ اس سلسلے میں اسے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

ادھر سردارا نے دوسری صبح تک جو معلومات حاصل کیں، ان کے مطابق چار افراد مختلف ہوٹلوں میں پچھلے کئی دنوں سے قیام کررہے تھے اور ایک سرکاری افسر بھی تین دنوں سے ڈاک بنگلے میں آیا ہوا تھا۔ اس افسر کے نام نے سردارا کو چونکا دیا۔ اس کا نام فرمان اکبر تھا۔

اس نے تیمور سے پوچھا۔ ''کیا تُو نے فرمان اکبر کو دیکھا ہے؟''

''نہیں... میں ڈاک بنگلے کے پیچھے چوکیدار کے پاس گیا تھا۔ اس نے بتایا' ہم بڑے چوک میں جو جلسہ کررہے تھے وہاں فرمان بھی گیا تھا۔''

''پھر تو اسے نجو کے گھر ہونے والی واردات کا بھی علم ہوگا؟''

''آہو۔ گڑ بڑ لگ رہی ہے۔ چوکیدار نے بتایا ہے' فرمان کل رات سے ڈاک بنگلے میں واپس نہیں آیا ہے۔''

''تو پھر وہاں جاکر معلوم کر۔ شاید وہ واپس آگیا ہو۔ یہ بھی پتا لگا کہ وہ پچھلی رات کہاں تھا؟ وہ جسوس کا بچہ نجو کے ریپڑ سے بھی دلچسپی لے سکتا ہے۔''

تیمور چلا گیا۔ سردارا رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ لہٰذا ڈیرے پر آکر سوگیا۔ دوپہر کو تینوں حواریوں نے آکر اسے جگایا۔ بابے ابلیس نے کہا۔ ''ابھی پتا چلا ہے' دارا شکوہ فیصل آباد جارہا ہے۔ بول... کی ارادے نیں...؟''

''ارادہ تو وہی ہے۔ راستے کا کانٹا صاف کرنا ہے۔ شوکت صاب خوش ہوجائیں گے۔''

''تے فیر تیاری پھڑ...''

بشارت نے کہا۔ ''ہم کو اس سے پہلے ہی فیصل آباد والے راستے کی ناکا بندی کرنی ہوگی۔''

وہ اٹھ کر حمام کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''ہم آدھے گھنٹے میں یہاں سے چل پڑیں گے۔ پر فرمان پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔ کیا وہ ڈاک بنگلے میں ہے؟''

تیمور نے کہا۔ ''وہ کل رات سے پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے؟ اب تک واپس نہیں آیا ہے۔ ہوٹل میں رہنے والے دو بندے بھی غائب ہیں۔''

وہ تینوں باہر آکر جیپ میں اسلحہ چھپانے لگے۔ بابے ابلیس نے کہا۔ ''کی خیال اے' او کدھر گم ہوگئے ہیں...؟''

''کیا کہا جاسکتا ہے؟ ویسے وہ جسوس بہت گہرا ہے۔ تین دنوں سے ہماری تاک میں ہے اور ہم اس سے بے خبر پھرتے رہے۔''

ادھر دارا شکوہ ان کے ارادوں سے بے خبر تھا۔ وہ سہ پہر تین بجے اپنے ڈرائیور کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوا۔ اسے چھ بجے تک فیصل آباد پہنچنا تھا لیکن ساٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار کا ایک پہیا اچانک ہی ایک زوردار آواز کے ساتھ ناکارہ ہوگیا۔ ڈرائیور نے بڑی مہارت سے گاڑی کو بے قابو ہونے سے بچاتے ہوئے روک لیا۔

دارا نے پچھلی سیٹ سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ''کیا مصیبت آگئی ہے؟ فوراً پہیا بدلو۔''

اس نے ڈرائیور کے ساتھ پہیے کو دیکھا تو ایک دم سے چونک گیا۔ وہ از خود بے کار نہیں ہوا تھا، کسی نے گولی مار کر اسے ناکارہ بنایا تھا۔ وہ اپنا ریوالور اٹھانے کے لیے تیزی سے پچھلی سیٹ کی طرف جانا چاہتا تھا، ایسے ہی وقت ایک گولی اس کی کمر میں آکر لگی۔ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گر پڑا۔ دوسری گولی نے ڈرائیور کا کام تمام کردیا۔

وہ زمین پر گھسٹتا ہوا پچھلی سیٹ تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ سڑک کے کنارے جھاڑیوں کے پیچھے سے سردارا اپنے ساتھیوں کے ساتھ نکل کر آیا۔ دارا کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ ''تُو نے بھرے بازار میں میری گڈی کا پہیا ناکارہ کردیا تھا۔ سب کے سامنے ہمیں ذلیل کیا تھا۔ میرے اس وقت کیں ہے' ورنہ تجھے تڑپا تڑپا کے مارتا۔ جا... تجھ پر رحم کردوں۔''

اس نے دو فائر کیے۔ اس پر رحم کیا۔ آدھی جان تو نکل چکی تھی، باقی آدھی بھی نکال دی۔ پھر وہ چاروں دوڑتے ہوئے کھیتوں سے گزرتے ہوئے بہت دور ایک کچی سڑک پر کھڑی ہوئی جیپ میں آکر بیٹھ گئے۔ موت کے کھیل کو جلدی ہی نمٹا کر واپس اپنی بستی میں اس طرح پہنچے کہ کسی کو چند گھنٹوں تک ان کی عدم موجودگی کا پتا ہی نہ چلا۔

آدھی رات کے بعد گشت کرنے والے سپاہیوں کی ٹیم دو لاشیں لے کر وہاں آئی تو دارا شکوہ کے گھر میں ماتمی کہرام مچ گیا۔ سلامت علی، طارق اور دوسرے تمام مجرا آکر پوچھنے لگے کہ دارا شکوہ کو اور اس کے ڈرائیور کو کس نے قتل کیا ہے؟ وہ لاشیں کہاں سے لائی گئی ہیں؟

لانے والوں نے صرف جائے واردات کے متعلق بتایا تھا۔ اس کے سوا وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ سلطان بگا بھی کئی سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا۔ فرمان اکبر نے اسے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میں ہوں سی آئی اے آفیسر آن ڈیوٹی... سردارا اور اس کے ساتھیوں کو بلاؤ۔''

بگا نے دو سپاہیوں کو سردارا کے ڈیرے کی طرف دوڑایا۔ فرمان اکبر لاشیں لانے والے سپاہیوں کو ایک طرف لے جاکر ان سے سوالات کررہا تھا۔ سردارا اپنے ساتھیوں کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر آگیا۔ اس نے سلطان بگا کے پاس آکر پوچھا۔ ''یہاں کیا ہورہا ہے؟ مجھے کیوں بلایا ہے؟''

وہ سن چکا تھا کہ وہاں لاشیں لائی گئی ہیں۔ بس یونہی انجان بن کر پوچھ رہا تھا۔ بگا نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔ ''سنبھل جاؤ۔ وہ جو ادھر سپاہیوں کے ساتھ کھڑا باتیں کررہا ہے، وہ سی آئی اے کا افسر ہے۔ بڑی سخت انکوائری ہونے والی ہے۔''

سردارا نے دور کھڑے فرمان کو دیکھ کر کہا۔ ''یہ... تو پہلے بھی یہاں آتا رہا ہے۔ میں نے کئی بار اسے شراب اور جوئے کے اڈے پر دیکھا ہے۔''

بابے ابلیس نے کہا۔ ''میں نے ایک سکول کے گیٹ پر اسے بشری سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے' یہ بجرووں کو پہلے سے جانتا ہے۔''

فرمان وہاں سے پلٹ کر ان کے پاس آگیا۔ سردارا کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بگا صاحب نے بتایا ہوگا کہ میں کون ہوں؟''

وہ بولا۔ ''جی ہاں۔ آپ کا حکم سنتے ہی حاضر ہوگیا ہوں۔ حکم کریں...؟''

فرمان نے پوچھا۔ ''آج تم اس ٹاؤن سے باہر گئے تھے؟''

''میں تو ادھر ہی تھا۔ اپنے ڈیرے پر آرام کررہا تھا۔''

''سوچ سمجھ کر جواب دو۔ تم جیپ میں بیٹھ کر کہیں گئے تھے؟''

''جیپ میں تو روز ہی بیٹھتا ہوں۔ آج بھی بیٹھ کر اسی ٹاؤن میں کئی جگہ گیا تھا۔ اگر کسی نے یہ کہا ہو کہ باہر گیا ہوں تو یہ غلط ہے۔''

''مقتول دارا شکوہ سے تمہاری دشمنی تھی کیا؟''

''او دشمنی نہیں جناب! معمولی سی رنجش تھی۔ وہ بھی جلد ہی دور ہوگئی تھی۔''

''دور نہیں ہوئی تھی اور بڑھ گئی تھی۔ مقتول نے بھرے بازار میں تمہاری بے عزتی کی تھی۔ سنا ہے' اس سے پہلے کوئی تمہارے سامنے سر اٹھا کر بولنے کی جرأت نہیں کرتا تھا؟''

''بندہ بشر ہے سرکار! کبھی عزت ملتی ہے، کبھی ذلت... میں بھی ذلت کو برداشت کرگیا۔ بات نہیں بڑھنے دی۔''

وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہُوں... بہت سمجھ دار ہو۔ خون کے گھونٹ پی کر خون اچھالنا خوب جانتے ہو۔''

وہ عاجزی سے بولا۔ ''آپ مائی باپ ہیں۔ میرے بارے میں کچھ بھی بول سکتے ہیں۔''

فرمان نے کہا۔ ''مقتول نے تمہاری جیپ کے پہیے کو ناکارہ بناکر تمہیں پیدل جانے پر مجبور کیا تھا۔ تم نے یہ ذلت برداشت نہیں کی۔ آج مقتول کی گاڑی کے ایک پہیے کو ناکارہ

بتادیا..."
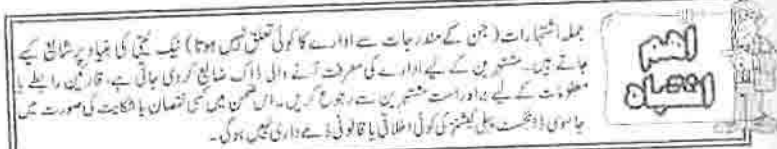
سردارا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ "انتقام لینے کے جوش میں غلطی ہو ہی جاتی ہے۔"

وہ بولا۔ "دیکھیں جناب! آپ مجھے ناکردہ جرم کی سزا دینے آئے ہیں۔ مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو کرلیں۔ مجھے تو ابھی ادھر آکے معلوم ہوا ہے کہ دارا شکوہ کو قتل کیا گیا ہے۔ آپ گھما پھرا کر باتیں کررہے ہیں۔ مجھے قاتل کہہ رہے ہیں تو یہ ناچیز بندہ کیا کہہ سکتا ہے؟ میں نے تو آج مقتول کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس سے آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ میں بے قصور ہوں۔ اس کے بعد آپ جیسا چاہیں مجھ سے سلوک کریں۔"

فرمان نے ملک سے کہا۔ "اسے لاک اپ میں رکھو۔ میں بعد میں اس سے سمجھوں گا۔ ان تینوں کو بھی حوالات میں ڈالو۔ پر انہیں سردارا سے دور رکھنا۔"

ان چاروں کو حراست میں لے لیا گیا۔ فرمان اکبر دارا شکوہ کے مکان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ کتنی ہی عورتیں اور مرد مکان کے اندر جارہے تھے اور باہر آرہے تھے۔

اس نے دارا کے بزرگوں سے کہا۔ "آپ آخری رسومات کی تیاریاں کریں۔ تدفین کل کسی وقت ہوسکے گی۔ ایمبولینس آرہی ہے۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے فیصل آباد لے جایا جائے گا۔"

ایسے وقت اس نے بشریٰ کو دیکھا۔ وہ بڑی اداسی سے سر جھکائے مکان کے اندر جانے والی تھی۔ فرمان کو دیکھ کر رک گئی۔ ایک بزرگ نے کہا۔ "یہ ہمارے گھر کی ہونے والی بہو تھی۔ صد افسوس! سہاگن بننے سے پہلے ہی سہاگ اجڑ گیا ہے۔"

فرمان اس کے پاس آکر بولا۔ "میں نہیں جانتا تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہے؟ میں قاتل کو گھیرنے کی کوششیں کررہا ہوں۔ تم نے پہلے بھی مجھ سے تعاون کیا تھا، اب بھی کرسکتی ہو۔ کل اسکول میں ملوگی؟"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "شاید نہ آسکوں۔ آپ میرے گھر آجائیں۔"

وہ بولتی ہوئی مکان کے اندر چلی گئی۔ فرمان نے اپنے چند ماتحتوں سے کہا۔ "تم میں سے ایک لاش کے ساتھ فیصل آباد جائے گا۔ باقی یہاں رہیں گے۔ میں سونے جارہا ہوں۔ کل صبح ملاقات ہوگی۔"

وہ اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر جانے لگا۔ بشریٰ کا اداس چہرہ اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ وہ کبھی اسکول کے احاطے میں، کبھی تنہائی میں کئی بار اس سے مل چکا تھا۔ وہ لڑکی کھلے ذہن اور کھلی آنکھوں سے اپنے آس پاس کی دنیا کو دیکھتی

تھی۔ اس نے فرمان کو بتایا تھا کہ اس علاقے میں کتنے ہی غریب روزی روٹی حاصل کرنے کے لیے سردارا کی غلامی کرتے ہیں اور منشیات کا زہر پھیلاتے ہیں۔

وہ غریب عورتوں کے گھروں میں جایا کرتی تھی۔ ان عورتوں کے باپ، بھائی اور بیٹے سردارا کے کارندے بن کر روزی کماتے تھے۔ اس نے فرمان کو ایسے دو چار بندوں کے نام اور پتے بھی بتائے تھے۔ فرمان نے ان لوگوں کو اپنے اعتماد میں لے کر سردارا کے خلاف انہیں اپنا مخبر بنالیا تھا۔

ان حالات میں بشریٰ اور اس کے درمیان پہلے شناسائی ہوئی۔ پھر وہ ایک دوسرے کے لیے کشش محسوس کرنے لگے۔ لیکن کبھی زبان سے یا کسی عمل سے دل کے معاملات کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ چپ چاپ ایک دوسرے کے متعلق سوچتے رہے۔

بشریٰ مجبور تھی۔ اس کا رشتہ طے ہوچکا تھا۔ اگلے برس شادی ہونے والی تھی مگر اب تقدیر کچھ اور ہی تماشا دکھانے جارہی تھی۔

اس نے ڈاک بنگلے کے ایک کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے بند کیا پھر بیڈ پر آکر لیٹ گیا۔ وہ پچھلی رات سے نجو کے معاملے میں بھاگتا رہا تھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ چار غنڈے اس گھر میں شرمناک واردات کرنے کے بعد فرار ہوگئے ہیں تو اس نے اپنے چاروں ماتحتوں کو مختلف سمتوں میں دوڑایا تھا اور خود فیصل آباد کی سمت موٹر سائیکل دوڑاتا چلا گیا تھا۔

وہ چاروں بہت آگے جاچکے تھے۔ اس کے ہاتھ کبھی نہ آتے مگر بدقسمتی کے ہاتھوں بڑے بڑے مجرم زیر ہوجاتے ہیں۔ تقریباً سو کلومیٹر تک جانے کے بعد ان کی گاڑی اچانک ہی خراب ہوگئی تھی۔ ان میں سے کوئی مکینک نہیں تھا۔ اچانک پیدا ہونے والی خرابی کو نہ کوئی سمجھ سکتا تھا اور نہ گاڑی کو قابلِ استعمال بنا سکتا تھا۔

ایسے وقت فرمان نے انہیں دور سے دیکھا۔ موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹس نے بتایا کہ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ ہے اور وہ کسی راہ گیر کے منتظر ہیں۔

وہ فوراً ہی موٹر سائیکل کو سڑک سے اتار کر کھیتوں میں چلا گیا۔ اسے راستہ بدلتا دیکھ کر انہوں نے فائرنگ کی۔ پھر کھیتوں کی طرف دوڑتے ہوئے ایک نے کہا۔ "سامنے آجاؤ... ہم تمہیں گولی نہیں ماریں گے۔"

انہیں کوئی جواب نہ ملا۔ ایک نے کہا۔ "وہ ادھر ہی چھپا ہوا ہے۔ اسے ڈھونڈو۔"

وہ چاروں کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے اسے ادھر اُدھر تلاش کرنے لگے۔ چاند کی روشنی میں ایک جگہ موٹر سائیکل پڑی ہوئی دکھائی دی۔ اسے دیکھ کر ایک نے آواز دی۔ "ادھر... اس کی گاڑی پڑی ہے۔"

دوسرے نے قریب آ کر کہا۔ "وہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔"

"چھپنے دو سالے کو۔ ہم اس گاڑی پر شہر تک جا سکتے ہیں۔"

"ہم چار ہیں۔ ایک موٹر سیکل پر کیسے جا سکیں گے؟"

ایک نے اپنی گن سیدھی کی۔ پھر اس کہنے والے کو گولی ماردی۔ وہ اچھل کر زمین پر گر پڑا۔ دوسرے نے دوسری گولی مارتے ہوئے کہا۔ "اسے تو ختم کرنا ہی تھا۔ ہم چاروں کے حصے میں دس دس ہزار آنے والے تھے۔ اگر ہم دو بھائی رہ جائیں گے تو ہمارے حصے میں بیس بیس ہزار آئیں گے۔"

یہ سنتے ہی تیسرے نے چونک کر دونوں بھائیوں کو دیکھا۔ فوراً ہی اپنی گن سیدھی کی۔ مگر چونکنے اور سنبھلنے میں دیر ہوگئی تھی۔ پھر فائر کی آواز گونجی۔ ایک گولی سینے کی ہڈیاں توڑتی ہوئی آر پار چلی گئی۔ اس موٹر سائیکل کی ایک سواری اور کم ہوگئی۔ دونوں بھائیوں نے ہنستے ہوئے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ پھر جھک کر موٹر سائیکل کو وہاں سے اٹھانے لگے۔

ایک نے کہا۔ "تو چلا۔ میں پیچھے بیٹھوں گا۔ یہ گاڑی بڑے اچھے وقت ہاتھ لگی ہے۔"

اچانک ہی ٹھائیں کی آواز کے ساتھ وہ بولنے والا چیخ مارتا ہوا گر پڑا۔ جو باقی رہ گیا تھا' وہ ایک درخت کی آڑ لینے کے لیے بھاگنے لگا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک عام موٹر سائیکل والے کے پاس گن ہوگی۔ دوسرے فائر کی آواز کے ساتھ ہی آخری شکار کے ہاتھ سے گن نکل گئی۔ اسے گولی نہیں لگی تھی مگر وہ لڑکھڑا کر گر پڑا تھا۔

وہ اوندھے منہ زمین پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر بھائی کی لاش پڑی تھی اور دوسری طرف ہاتھ سے نکلی ہوئی گن دکھائی دے رہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا' حملہ آور کہاں ہے؟ یہ اندیشہ تھا کہ زمین سے اٹھے گا یا گن کی طرف ہاتھ بڑھائے گا تو مارا جائے گا۔ وہ تھوڑی دیر تک چپ چاپ پڑا سوچتا رہا۔ پھر فرمان کی آواز سنائی دی۔ "کیا تم شوکت آباد سے آ رہے ہو؟"

وہ ذرا سر اٹھا کر بولا۔ "ہاں... پر تم کون ہو؟"

"کوئی سوال نہ کرو۔ صرف جواب دو... کیا تم نے دین محمد سائیکل والے کے گھر میں واردات کی ہے؟"

وہ سمجھ گیا کہ اسے بے بس کرنے والا قانون کا کوئی محافظ ہے۔ اس نے کہا۔ "نہیں... ہم کسی دین محمد کو نہیں جانتے۔ ہم نے کوئی واردات نہیں کی ہے۔"

"کیا تم چاروں اسلحہ لے کر اپنی ماں کی جیج میں گئے تھے؟"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں..."

"قسم نہ کھاؤ۔ گولی کھاؤ اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مر جاؤ یا قانون کا ساتھ دو۔ سچ اگلو گے تو میں تمہیں سزا سے بچاؤں گا۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ فرمان کی آواز سنائی دی۔ "تمہارے تینوں ساتھی مر چکے ہیں۔ اب پورے چالیس ہزار تمہارے ہوں گے۔ زندگی کی سانسیں بھی ملیں گی۔ جلد فیصلہ کرو۔"

وہ بولا۔ "م... میں مرنا نہیں چاہتا۔ ہاں، ہم نے وہاں واردات کی ہے۔"

"تم چاروں کہاں سے آئے ہو؟"

"لاہور سے..."

"اس کا مطلب ہے اتنی دور آ کر کسی دوسرے کے لیے واردات کی ہے؟ چالیس ہزار کس نے دیئے ہیں؟"

"یہ جان کر کیا کرو گے؟ اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ کوئی ثبوت نہیں ملے گا کہ اس نے ہم سے کام لیا تھا۔ میں ایسے بھی مارا جا رہا ہوں، ویسے بھی مارا جاؤں گا۔"

"میں اصل مجرم تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ اسے قانون کے شکنجے میں لینا میرا کام ہے۔ وقت برباد نہ کرو۔ جواب دو...؟"

وہ چند لمحوں تک چپ رہا پھر بولا۔ "سردارا کا ایک خاص بندہ بابے اکبیس آیا تھا۔ اس نے چالیس ہزار دے کر معاملات طے کیے تھے۔"

"معاملات بتاؤ... ایک غریب سائیکل والے سے سردارا کی کیا دشمنی ہے؟"

"دشمنی کیا تھی' ہم نہیں جانتے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم اس کی جوان بیٹی کی آبرو لوٹیں اور اس کا حلیہ بگاڑ کر چلے آئیں۔"

فرمان نے پوچھا۔ "بس اتنا ہی... یا اور کچھ...؟"

"ہمیں دو چار باتیں یاد کرائی گئی تھیں اور تاکید کی تھی کہ وہ باتیں ہم ماں بیٹی سے ضرور کہیں گے۔"

"وہ باتیں کیا تھیں؟"

"میں نے اس لڑکی کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر لباس پھاڑتے ہوئے کہا تھا۔ سالی! گجروں کے گھرانے میں بہو بن کر جانے کا خواب دیکھ رہی ہے۔ آج کے بعد کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔"

"ان گجروں کے نام بتاؤ...؟"

"ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور جاننا ضروری بھی نہیں تھا۔ انہوں نے جو سکھایا' وہی ماں بیٹی سے کہہ دیا۔"

"کوئی بات نہیں... میں معلوم کرلوں گا۔ وہ بدنصیب گجر خاندان کی بہو بننا چاہتی تھی۔"

وہ آہستہ آہستہ اپنی گن کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ اسی فائر کی آواز کے ساتھ ایک گولی اس کے ہاتھ کو چھو کر گزر گئی۔ وہ چیخ کر بولا۔ "گولی نہ چلانا۔ م... میں چپ چاپ پڑا ہوں گا۔"

فرمان نے کہا۔ "اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور موٹر سائیکل سڑک پر لے آؤ۔"

اس نے فوراً ہی اٹھ کر حکم کی تعمیل کی۔ وہاں سے موٹر سائیکل کو اٹھا کر سڑک پر لاتے ہوئے ایک قد آور جوان کو دیکھا۔ وہ فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا قریب آ کر بولا۔ "بیٹھو اور اسے اسٹارٹ کرو۔"

وہ چور نظروں سے ریوالور کو دیکھتے ہوئے گاڑی پر سوار ہو گیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کرنے لگا۔ فرمان نے پیچھے بیٹھ کر ریوالور کی نال اس کی پسلی میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ذرا بھی چالاکی دکھاؤ گے تو گولی چل جائے گی۔ زندہ رہنے کے لیے چپ چاپ چلتے رہو۔"

جان بہت پیاری ہوتی ہے۔ نال پسلی سے لگی ہوئی تھی۔ وہ زندگی کی سانسیں کمانے کے لیے آگے چل پڑا۔

☆☆☆

شوکت علی کامرانی عاشق مزاج نہیں تھا۔ مگر پہلی بار محسوس کر رہا تھا کہ بشریٰ کے متعلق سنجیدگی سے نہ سوچنے کے باوجود وہ آپ ہی آپ اس کے خیالوں میں چلی آتی ہے۔ اہم سیاسی معاملات نمٹانے کے دوران بھی وہ کئی بار بے اختیار اس کے متعلق سوچتا رہا اور حیران ہوتا رہا کہ یہ کیسا جادو ہے جو سر چڑھ کر بول رہا ہے؟

پچھلی رات اسے خوش خبری ملی تھی کہ سردارا نے راستے کا کانٹا صاف کر دیا ہے۔ اب بشریٰ کا کوئی منگیتر نہیں رہا ہے۔ جب دارا شکوہ کا معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو وہ بشریٰ کے باپ سے اس کا رشتہ مانگے گا۔ اسے یقین تھا کہ ایک بہت بڑی سیاسی شخصیت رکھنے والے جاگیردار کو داماد بنانے پر وہ فخر کرے گا۔

دوسری صبح سلطان بگا نے حاضر ہو کر کہا۔ "جناب عالی! بڑا رولا پڑ گیا ہے۔ ان نئے سی آئی اے کے افسر نے سردارا اور اس کے تینوں ساتھیوں کو لاک اپ میں رکھنے کا حکم دیا ہے اور میں نے مجبوراً تعمیل کی ہے۔"

اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے پوچھا۔ "ان پر کیا الزام لگایا گیا ہے؟"

"دارا شکوہ کے قتل کا الزام ہے۔ فرمان اکبر نے ایک چھوٹی سی بات پکڑی ہے۔ دو دن پہلے دارا شکوہ نے سردارا کی جیپ کے ایک پہیے کو ناکارہ بنایا تھا۔ اب اس نے بھی اس کی گاڑی کے ایک پہیے کو ناکارہ بنانے کے بعد اسے قتل کیا ہے جبکہ یہ سردارا کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

"وہ افسر بہت گہرا چالباز ہے۔ ایک چھوٹی سی بات لے کر ہمارے اہم کارندے کو گھیر رہا ہے۔"

"جناب عالی! سردارا مجھے پریشان کرتا ہے۔ کہتا ہے اسے حوالات سے نکالا جائے اور آپ سے بات کرائی جائے۔"

"وہ اپنی رہائی کے سوا اور کوئی بات نہیں کرے گا۔ اسے سمجھاؤ... یہ معاملہ سی آئی اے والوں کا ہے۔ کورٹ سے آرڈر حاصل کیے بغیر رہائی ممکن نہیں ہوگی۔"

"میں اسے ہر پہلو سے سمجھا رہا ہوں۔ پر وہ خر دماغ ہے۔ ایک ہی بات کہتا ہے کہ ایسے وقت اگر آپ نے ساتھ نہ دیا تو وہ حوالات سے نکل بھاگے گا اور مجھے اس سلسلے میں اس کا ساتھ دینا ہوگا۔"

"وہ ایسی حماقت کرے گا تو میرے لیے مسائل پیدا ہوں گے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔ "اس سے بات کراؤ..."

بگا نے ریسیور اٹھا کر تھانے کے نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر سپاہی سے کہا۔ "فون سردارا کے پاس لے جاؤ۔ کامرانی صاحب بات کریں گے۔"

اس نے ذرا دیر انتظار کیا پھر کہا۔ "ہیلو سردارا لو... کامرانی صاحب سے بات کرو۔"

شوکت علی نے اس سے ریسیور لے کر کان سے لگایا پھر کہا۔ "اس افسر نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی تمہیں حراست میں رکھا ہے۔"

"جناب عالی! وہ بکواس کرتا ہے۔ اس کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ایوئیں فضول کارروائیاں کر کے خوف زدہ کر کے ہم سے اقبالِ جرم کرانا چاہتا ہے۔"

"او میں جانتا ہوں' تم خوف زدہ ہونے والوں میں سے نہیں ہو۔ آرام سے حوالات میں رہو۔ میرا وکیل آج ہی کورٹ سے تمہارا ضمانت نامہ لے لے گا۔ اس سی آئی اے والے سے الجھنا نہیں ہے۔ اسے اپنی کرنے دو، ہم اپنا کام

کر گزریں گے۔"

"جناب عالی! میتوں یقین اے' آپ مجھے جلدی یہاں سے نکال لیں گے۔ ورنہ یہ تو سمجھتے ہی ہیں کہ سی آئی اے والے اگر مجھے نارچر سیل وچ لے گئے تے فیر میرے پیٹ سے آپ کا کچا چٹھا بھی باہر آجائے گا۔"

وہ غصے سے بولا۔ "جانتا ہوں... جانتا ہوں۔ کتنی بار سمجھایا ہے فون پر ایسی باتیں نہ کیا کر۔"

اس نے ریسیور کریڈل پر پٹختے ہوئے بگا کو دیکھا پھر کہا۔ "یہ کتا ڈھکے چھپے لفظوں میں دھمکی ضرور دیتا ہے۔ ہماری بھی کیا مجبوری ہے؟ سنگین معاملات میں ان غنڈوں کو اپنا راز دار بنانا اور بعد میں پچھتانا پڑتا ہے۔"

وہ ریسیور اٹھا کر نمبر پنچ کرتے ہوئے بولا۔ "میں وکیل سے بات کرتا ہوں۔ ان کتوں کی ضمانت ہو جائے گی۔"

وہ بولا۔ "مجھے اجازت دیں۔ تھانے میں رہنا ضروری ہے۔ وہ افسر کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔"

شوکت علی نے سر ہلایا۔ وہ وہاں سے چلتا ہوا کوٹھی کے باہر آ گیا پھر موبائل میں بیٹھ کر سپاہیوں سے بولا۔ "تھانے چلو..."

ایسے وقت ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا پھر اسے سیلیوٹ کرتے ہوئے بولا۔ "سر! وہ سی آئی اے والا دین محمد کے گھر پہنچا ہوا ہے۔"

سلطان بگا نے پریشان ہو کر زیر لب کہا۔ "وہ کم بخت وہاں کیوں پہنچا ہے؟ پتا نہیں کس قسم کی معلومات حاصل کر رہا ہوگا؟ ویسے ہمارے خلاف اسے کچھ معلوم نہیں ہو سکے گا پھر بھی..."

اس نے سپاہی سے کہا۔ "چلو... دین محمد کے گھر چلو۔"

موبائل وین اُدھر چل پڑی۔ فرمان اکبر دین محمد کے گھر میں ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری چارپائی پر نجو اپنی ماں کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی تھی اور فرمان کے سوالات کے جوابات دے رہی تھی۔ وہ بولا۔ "ذرا عقل سے سوچو... اگر وہ لٹیرے سلامت علی کی طرف سے آتے تو کبھی ایسی باتیں نہ کرتے جنہیں سن کر تم ماں بیٹی شبہ کر رہی ہو۔ مجرم خود کو چھپاتے ہیں، کبھی ظاہر نہیں ہوتے۔"

ماں نے پوچھا۔ "تے فیر انہوں نے ایسی باتیں کیوں کیں؟"

"انہیں یہ باتیں سکھائی گئی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ نجو کی وجہ سے ان باپ بیٹے میں نفرت اور عداوت پیدا ہو جائے۔"

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔"

"یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ان بدمعاشوں کے پیچھے کوئی اور ہے جو باپ بیٹے کی لڑائی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔"

طارق دروازے پر کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا۔ کمرے میں آتے ہوئے بولا۔ "آپ کی باتیں دل کو لگ رہی ہیں۔ آپ کون ہیں؟"

فرمان نے اپنا کارڈ دکھایا۔ طارق نے اسے پڑھ کر کہا۔ "اچھا، سمجھ گیا... کل رات آپ نے ہی سردارا اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا ہے اور باہر آپ کے لوگ کھڑے ہوئے ہیں۔"

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "میرا نام طارق ہے۔ میں سلامت علی کا بیٹا ہوں۔"

فرمان نے اس سے مصافحہ کیا۔ وہ بولا۔ "سردارا میری بہن کا رشتہ مانگنے آیا تھا۔ میں نے اس غنڈے کو اس کی اوقات سمجھائی تھی۔ تب سے وہ ہمارا دشمن بن گیا ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں اسی نے اس گھر میں واردات کرائی ہے۔ نجو کو برباد کیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

فرمان نے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آرام سے بیٹھو۔ اتنا تیز نہ بھاگو منہ کے بل گر پڑو گے۔"

"آپ اسے معمولی بات نہ سمجھیں۔ نجو اپنے دشمنوں کو تڑپ تڑپ کر مرتا دیکھنا چاہتی ہے۔ میں اس کی خواہش ضرور پوری کروں گا۔ آپ... سردارا کو میرے حوالے کر دیں۔"

فرمان نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "مطلب یہ کہ تم ہیرو بن کر اسے اپنی محبوبہ کے سامنے قتل کرنا چاہتے ہو؟"

"آہو جی۔ میں اسے گولیوں سے بھون کے رکھ دوں گا۔"

اس نے اپنے ماتحتوں کو آوازیں دیں۔ وہ سب کمرے میں چلے آئے۔ ایک نے پوچھا۔ "یس سر!"

وہ طارق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ اپنے ایک دشمن کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ اسے حراست میں لے لو۔"

طارق نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔ "مم... میں نے تو ابھی کوئی جرم نہیں کیا ہے جناب!"

"کرنے والے ہو۔ ہونے والی واردات کو روکنا میرا فرض ہے۔"

نجو نے کہا۔ "جناب! یہ جوش میں ایسا کہہ رہا تھا۔ اسے معافی دے دیں۔"

[illegible] اور جنون میں جکڑا ہونے والے ہی خون [illegible] ہیں۔ تم لوگ عقل سے اور صبر و تحمل سے کام [illegible]؟ یہ دیکھ رہے ہو کہ قانونی کارروائی صحیح سمت [illegible] پھر جوش میں آنا کیا ضروری ہے؟"

طارق نے سر جھکا کر کہا۔ "معافی چاہتا ہوں جناب! آپ [illegible] فرماتے ہیں۔ ہمیں قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا [illegible] صرف آپ جیسوں کی مدد کرنی چاہیے۔"

فرمان نے اٹھ کر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ [illegible] اندر سے ٹوٹ گئی ہے۔ اسے سنبھالو۔ میں تمہارے [illegible] بچاؤں گا۔"

پھر وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ چلتا ہوا مکان سے باہر [illegible] ایسے وقت سلطان بگا وہاں پہنچ گیا تھا۔ موبائل سے [illegible] ہوئے بولا۔ "مجھے معلوم ہوا آپ اِدھر ہیں تو چلا آیا۔ [illegible] واردات کرنے والوں کا سراغ مل رہا ہے؟"

"بگا صاحب! آپ تو بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ معلوم [illegible] کہ آپ نے پلک جھپکتے ہی واردات کرنے والے [illegible] علی کو گرفتار کر لیا تھا؟"

"پچیس برسوں سے تھانے دار ہوں۔ کبھی ترقی نہیں [illegible] دور ہی سے مجرموں کی بُو سونگھ لیتا ہوں۔"

"شاید اسی لیے ترقی نہیں ہوتی کہ مجرموں کو گرفتار [illegible] کے بعد چھوڑ دیتے ہیں۔ سلامت علی کو بھی رہا [illegible] کیا تھا۔"

وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "جناب شوکت علی کامرانی کا حکم [illegible] میں نے ان کی ضمانت پر عارضی رہائی دی ہے۔ پر مقدمہ [illegible] چلے گا۔"

"مجھے رہائی پر اعتراض نہیں ہے۔ آپ نے اچھا ہی [illegible] اصل مجرم کوئی اور ہے، سلامت علی نہیں ہے۔"

اس نے چونک کر پوچھا۔ "کون ہے...؟"

"یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے۔ چلیں! تھانے چل کر [illegible] کرتے ہوں گی۔"

فرمان پولیس موبائل میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے راستے [illegible] باتیں کرتے ہوئے سلطان بگا کو قائل کیا کہ اصل مجرم نے ان چار غنڈوں کو ایسی باتیں کرنے کی تاکید کی تھی جنہیں سن کر سلامت علی پر شبہ ہوتا ہے جبکہ کوئی بھی مجرم اپنے خلاف [illegible] ظاہر کرنے والی کوئی بات اور حماقت نہیں کرتا۔ سلطان بگا دل ہی دل میں قائل ہو رہا تھا کہ وہ سی آئی اے والا بڑی [illegible] چیز ہے۔ واردات کی تہ تک پہنچ رہا ہے۔

وہ تھانے میں آئے تو بگا وہاں نئی پولیس فورس کو دیکھ کر چونک گیا۔ فرمان نے کہا۔ "یہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ سے آئے ہیں۔ اصل مجرموں کو اپنی کسٹڈی میں لے جائیں گے۔ آپ سردارا اور اس کے ساتھیوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر حوالات سے باہر لائیں۔"

وہ ایک کرسی پر آرام سے بیٹھ گیا۔ سلطان بگا نے اپنے سپاہیوں سے اس کے حکم کی تعمیل کرائی۔ ان چاروں کو ہتھکڑیاں پہنا کر فرمان سے کچھ دور فرش پر اکڑوں بٹھا دیا گیا۔

سردارا نے کہا۔ "اے ساڈے نال زیادتی ہو رہی اے۔ میں جناب کامرانی صاب کا خاص ملازم ہوں۔ مجھے اپنی صفائی دینے اور ضمانت لینے کا موقع ملنا چاہیے۔"

فرمان نے کہا۔ "تم بہت بڑے جاگیردار اور منسٹر کے ملازم ہو۔ وہ تمہیں ضمانت پر رہا ضرور کرائیں گے۔ پر ابھی میرے سوالوں کے جوابات دیتے رہو۔ جیدی، بابر منگلی اور جبار کو جانتے ہو؟"

وہ ذرا چونکا پھر بولا۔ "میں کسی کو نہیں جانتا سرکار...!"

"بابے ابلیس جانتا ہے۔ اس نے واردات کرانے کے لیے جیدی کو چالیس ہزار روپے دیے تھے۔"

بابے ابلیس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "رب دی سوں جناب...! نجو میری دھی جیسی ہے۔ میں نے وہاں واردات نہیں..."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فرمان نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔ وہ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ فرمان نے کہا۔ "میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ نجو کے گھر میں واردات کرائی گئی ہے۔ تُو خود ہی اگل رہا ہے۔"

سردارا، بشارت اور تیمور غصے سے گھور کر بابے کو دیکھنے لگے۔ منہ پر ایسی ٹھوکر پڑی تھی کہ وہ فرش پر گر کر تڑپ رہا تھا۔ فرمان نے سردارا کے سامنے آ کر کہا۔ "جیدی سے تمہاری پرانی یاری ہے۔ ایک ساتھ جیل میں بھی رہ چکے ہو۔ ایک دوسرے کے لیے واردات کرتے رہتے ہو۔ تم نے بابے کو چالیس ہزار دے کر جیدی کے پاس بھیجا تھا۔"

وہ بولا۔ "قانون آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کوئی بھی کہانی شہانی بنا سکتے ہیں۔"

فرمان نے اس کے منہ پر بھی ایک ٹھوکر ماری تو وہ غصے سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور گرجتے ہوئے بولا۔ "مجھے ہتھکڑیاں پہنا کے کیا مردانگی دکھا رہے ہو؟ مرد ہو تو میرے ہتھ کھولو۔ میں تمہاری ہڈیاں توڑ کے رکھ دوں گا۔"

فرمان نے کہا۔ "جو تمہاری بے عزتی کرتا ہے، تم اس

کی ہڈیاں توڑ دیتے ہو؟"

"اوآہو... ابھی آزما کے دیکھ لو۔"

"ہاں۔ ابھی آزما کے دیکھ لو جیسے دارا شکوہ کو قتل کیا...."

"یا... میں..."

وہ کہتے کہتے سنبھل گیا۔ پھر بولا۔ "میں نے دارا شکوہ کو قتل نہیں کیا ہے۔ ایک بات سمجھا تا ہوں۔ مجھ پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔"

"ورنہ میری ہڈیاں توڑ دو گے؟"

وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر ایک درندے کی طرح غرا رہا تھا۔ فرمان نے بگا سے کہا۔ "اس کی ہتھکڑیاں کھول دو۔"

بگا نے تعجب سے کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"جیدی نے اس کے خلاف بیان دیا ہے۔ وہ ہماری حراست میں ہے۔ اسے کوئی جاگیردار کوئی سیاست دان بچا نہیں سکے گا۔ اس کے بچاؤ کا ایک ہی راستہ ہے۔"

بگا اور سردارا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "یہ میری ہڈیاں توڑ کے یہاں سے جا سکتا ہے۔ ایسے وقت کوئی اس کا راستہ نہیں روکے گا۔ اسے فرار ہونے کا پورا موقع دیا جائے گا۔"

سب ہی کو چپ لگ گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ سردارا نے بگا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری ہتھکڑیاں کھول دے تھانے دار... ! میں اینٹ دا جواب پتھر سے دوں گا۔"

بابے نے کہا۔ "تیری مت ماری گئی اے... عقل سے کام لے۔ تیرا غصہ تجھے کھا جائے گا۔"

وہ بولا۔ "میں بزدل نہیں ہوں۔ چوہے دانگوں پنجرے وچ رہ کے نئیں مراں گا۔"

سلطان نے کہا۔ "او بے وقوفا! لڑنا تو دور کی بات ہے، ڈیوٹی پر رہنے والے افسر پر ہاتھ بھی اٹھائے گا تو تیری ضمانت نہیں ہوگی۔"

سردارا نے یوں چونک کر فرمان کو دیکھا جیسے عقل آ گئی ہو۔ بشارت نے کہا۔ "سردارا! یہ افسر بہت چالاک ہے۔ تجھ سے جان بوجھ کر مار کھائے گا اور ایک نیا کیس بنا دے گا۔ فیر جناب کامرانی صاب بھی اس کے شکنجے سے ہمیں نکال نہیں پائیں گے۔"

فرمان نے اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "زیادہ عقل مند بن کر سردارا کو بے وقوف نہ بنا۔ اس کی عقل مندی یہی ہوگی کہ یہ مجھ سے مقابلہ کرے گا۔ مجھے مات دے گا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں! اسے یہاں سے جانے سے کوئی نہیں روکے گا۔"

سردارا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مجھے معافی دے دو سرکار۔ آپ کی چالاکی سمجھ آ گئی ہے۔ اب تو آپ مجھے ٹھوکریں بھی ماریں گے تو اُف نہیں کروں گا۔"

فرمان نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "ان چاروں کو لے جاؤ۔ میں کل تک ہیڈ کوارٹر میں آؤں گا۔"

تھانے کے باہر قیدیوں کو لے جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ ڈیپارٹمنٹ سے آنے والے سپاہی انہیں اس میں بٹھا کر لے جانے لگے۔ تھانے کے باہر بے شمار افراد سردارا کی گرفتاری اپنی آنکھوں سے دیکھنے آئے تھے اور ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ اس بار اوپر سے انکوائری اور گرفتاری آئی ہے۔ شوکت آباد کے غنڈے ضرور عبرت ناک انجام کو پہنچیں گے۔

اس بھیڑ میں طارق بھی تھا۔ وہ لوگوں کو فرمان اکبر کے متعلق بتا رہا تھا کہ وہ ایک فرض شناس اور ذمے دار افسر ہے۔ اس نے آتے ہی نجو پر مظالم ڈھانے والے مجرموں کو گرفتار کرایا ہے۔ اگر یہ افسر اس ٹاؤن میں رہے گا تو وہاں سے تمام غنڈے بھاگ جائیں گے۔

فرمان نے پچھلی رات بشریٰ سے بات کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ دوسرے دن اس سے ملنے کے لیے گھر آ سکتا ہے۔ اس نے طارق کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر اسے پاس بلا کر پوچھا۔ "تمہارے والد سلامت علی کہاں ہیں؟"

اس نے کہا۔ "شاید گھر میں ہیں۔"

"کیا میں تمہارے گھر جا کر ان سے مل سکتا ہوں؟"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "آہو جی... یہ ہماری عزت افزائی ہوگی۔ آپ ابھی چلیں۔"

وہ اصل مجرموں کو گرفتار کرنے کے لیے پچھلے کئی روز سے دن رات مصروف رہا تھا۔ وہ بُری طرح تھکا ہوا تھا۔ طارق کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو بشریٰ کو دیکھتے ہی ساری تھکن اتر گئی۔ سلامت علی نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور احسان مندی سے کہا۔ "آپ نے میرے گھر کو تباہ ہونے سے بچایا ہے۔ اگر نجو کو تباہ کرنے والے گرفتار نہ ہوتے تو میرا پتر ساری حیاتی مجھے دشمن سمجھتا رہتا۔"

فرمان نے سمجھایا۔ "بیٹا آپ کا دشمن نہیں ہے۔ غلط فہمی کے باعث بستے بستے گھر اجڑ جاتے ہیں۔ رب کا شکر ہے آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ آئندہ آپ اپنے دشمنوں سے محتاط رہا کریں۔"

سلامت علی نے کہا۔ "میں تو بہت محتاط رہنے لگا ہوں۔"

بشریٰ کسی نہ کسی کام کے بہانے آ رہی تھی، جا رہی تھی اور اپنا دیدار کرا رہی تھی۔ طارق نے باپ سے کہا۔ "محتاط رہنے کے لیے دشمنوں کو پہچاننا چاہیے۔ پر تم تو شوکت علی کامرانی جیسے دشمن کا قصیدہ پڑھتے رہتے ہو۔"

سلامت نے کہا۔ "کیوں نہ پڑھوں؟ وہ میری ضمانت کے لیے خود چل کر تھانے آیا تھا۔"

فرمان نے کہا۔ "او بزرگو! بڑے لوگ اس وقت جھکتے ہیں جب زمین پر پڑا ہوا منافع اٹھانا لازمی ہو جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا، وہ مغرور جاگیردار آپ کی رہائی کے لیے تھانے کیوں آیا تھا؟ جبکہ ایک فون کال کے ذریعے بھی رہائی کا حکم دے سکتا تھا۔"

سلامت نے کہا۔ "سب ہی جاگیردار ظالم اور خود غرض نہیں ہوتے۔"

طارق نے کہا۔ "ہوتے ہیں ابا! وہ بہت چالباز ہے۔ اس نے دودھ کی قیمت گرا دی ہے۔ ہمارے کاروبار کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ دوسری طرف تم سے ہمدردی بھی کر رہا ہے۔ ایک معصوم اور مظلوم بچی کو لوٹ لیا گیا۔ اس کی حیاتی تباہ کر دی گئی۔ پر وہ اس غریب کے سر پر ہاتھ رکھنے بھی نہیں آیا۔"

فرمان نے کہا۔ "ہم مجرمانہ ہتھکنڈوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شوکت علی کامرانی اور سلطان بگا کی سرپرستی میں یہاں منشیات کا کاروبار ہو رہا ہے۔ اس لیے سردارا قانون کی گرفت سے محفوظ رہتا ہے۔ وہ جاگیردار یہ جانتا تھا کہ سردارا نے نجو کے گھر میں واردات کرائی ہے اور اسی نے آپ باپ بیٹے کے درمیان دشمنی بڑھائی ہے۔ یہ جاننے کے باوجود اس نے آپ کو حقیقت نہیں بتائی۔ آپ کو خود سمجھنا چاہیے۔ وہ سامنے سر سہلا رہا ہے اور پیچھے سے ٹھوکریں مار رہا ہے۔"

بشریٰ ٹھنڈی لسّی بنا کر لے آئی۔ فرمان نے ایک گلاس لیتے ہوئے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ پھر کہا۔ "میں نے یہاں آ کر خواتین کے ذریعے بڑی اہم معلومات حاصل کیں۔ پھر رفتہ رفتہ سردارا کی گردن دبوچ لی۔ اب ایک اور اہم معلومات رہ گئی ہے۔"

طارق نے کہا۔ "آپ مجھے خدمت کا موقع دیں... اور کیسی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں؟"

"اس علاقے میں کہیں منشیات کا ذخیرہ چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ میں اس خفیہ مقام تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ سردارا کے کئی کارندے میرے لیے مخبری کرتے ہیں لیکن وہ بے چارے بھی خفیہ اڈے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

طارق نے کہا۔ "پھر تو ایسی جگہ کا سراغ لگانا بڑا اوکھا ہوگا۔"

"مشکل تو ہے پر نا ممکن نہیں ہے۔ سردارا کے کارندے بڑے سخت جان ہیں۔ جان دینا جانتے ہیں، راز اگلنا نہیں جانتے۔ پر ان کی گھر والیاں ضرور پیٹ کی ہلکی ہوں گی۔ ان سے کوئی سمجھ دار تعلیم یافتہ لڑکی دوستی کر کے بہت کچھ اگلوا سکتی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے چور نظروں سے بشریٰ کو دیکھا۔ سلامت علی نے کہا۔ "آپ کے ڈیپارٹمنٹ میں ایسی زنانیاں ہوں گی؟"

"ہیں تو سہی... پر وہ ادھر آئیں گی تو مجرم اور زیادہ محتاط ہو جائیں گے۔"

طارق نے کہا۔ "ہماری بشریٰ بڑی ذہین ہے۔ وہ ایسی عورتوں سے دوستی کر کے شاید کچھ معلوم کر سکے۔"

فرمان نے سلامت علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ دونوں مجھ سے تعاون کریں گے تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔"

سلامت علی نے کہا۔ "آپ ہمارے محسن ہیں۔ ہم یہاں سے غنڈا راج ختم کرنے کے لیے تعاون ضرور کریں گے۔ یہ فرمائیں، ہماری دھی رانی آپ کے لیے کیا کر سکتی ہے؟"

"آپ اسے یہاں بلائیں۔ میں اس کام کے سلسلے میں کچھ اہم باتیں اسے سمجھاؤں گا۔"

اس نے بیٹی کو بلا کر کہا۔ "ادھر بیٹھو اور فرمان صاب کی باتیں سنو۔ یہ تمہارے ذریعے مجرموں کی کمر توڑنا چاہتے ہیں۔"

وہ آنچل درست کرتی ہوئی دوسری چارپائی پر اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ دونوں نے اب تک دل کی باتیں ایک دوسرے کو نہیں سنائی تھیں اور نہ ہی اب سنانا چاہتے تھے۔ تنہائی میں باتیں کرنے کی خواہش بھی نہیں تھی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہو جاتے تھے۔ پیار و محبت کی رنگین وادیوں میں بھٹکنے لگتے تھے۔

اس وقت باپ بھائی کی موجودگی میں اگر چہ کام کی باتیں کر رہے تھے، تاہم ایک دوسرے کی قربت سے محظوظ ہو رہے تھے۔

☆☆☆

بشریٰ نے خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے ایک ادارہ قائم کر لیا۔ چند غریب عورتوں کو ماہانہ دو ہزار روپے دینے کی پیشکش کی پھر ان کے ساتھ گھر گھر جا کر ناخواندہ عورتوں کو صحت و صفائی کا درس دینے لگی۔ اس طرح وہ ان کے گھروں کے اندر جا کر دیر تک رہتی تھی اور باتیں کرتی رہتی تھی۔ اتنی اپنائیت سے بولتی تھی کہ وہ اپنی گھریلو اور ازدواجی زندگی کی ڈھکی چھپی باتیں بھی اس کے سامنے اگل دیتی تھیں۔

ایسے طریقہ کار کے ذریعے منشیات کے خفیہ ذخیرے تک پہنچنے کا یقین ہوتا جا رہا تھا۔ سلطان بگا کے سپاہیوں اور سردارا کے کارندوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بشریٰ جیسی بے ضرر اور سیدھی سادی سی طالبہ دو پردہ فرمان اکبر کے لیے کام کر رہی ہے۔

شوکت علی کامرانی عارضی طور پر بشریٰ کو بھول گیا تھا۔ سردارا جب بھی قانون کی گرفت میں آتا تھا تو شوکت علی کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ اسے ٹارچ سیل میں نہ لے جایا جائے۔ وہ وہاں مجبور ہو کر اس بڑے جاگیردار اور سیاست دان کے خلاف بہت کچھ اگل سکتا تھا۔

وہ سردارا کی خاطر کچھ روز کے لیے لاہور آ گیا تھا۔ اسے الزامات سے بری کرانے اور رہائی دلانے کے لیے مخفی سیاسی چالیں چل رہا تھا اور مجرمانہ ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ یہ تو سب ہی جانتے اور مانتے ہیں کہ سیاست دانوں سے تعلق رکھنے والے بدمعاشوں کو ڈھیل دی جاتی ہے۔ اگر وہ گرفتار ہوتے ہیں تو دو چار ماہ میں رہا ہو کر چلے آتے ہیں... یا ان کے خلاف کسی طرح کا الزام ثابت ہی نہیں ہوتا۔

نجو کے گھر میں واردات کرنے والا جیدی اس بات کا گواہ تھا کہ سردارا نے چالیس ہزار روپے دے کر وہ شرمناک واردات کرائی تھی۔ اس اہم چشم دید مہرے کو بڑے پُراسرار طریقے سے لاک اپ میں مار دیا گیا۔ اس کے بیانات پر مبنی پوری فائل بھی غائب کر دی گئی تھی۔

فرمان اکبر نے جان پر کھیل کر مجرموں سے کاؤنٹر فائرنگ کے بعد جیدی کو قانون کے شکنجے میں لیا تھا۔ اس کے بعد سردارا سے ٹارچ سیل میں بہت کچھ اگلوایا جا سکتا تھا۔ مگر اس فرض شناس افسر کی تمام محنت پر پانی پھر گیا اور اصل مجرم کو رہائی مل گئی۔

شوکت آباد کے باشندوں نے حیرانی و پریشانی سے دیکھا۔ سردارا اور اس کے دیگر حواری فاتحانہ شان سے فائرنگ کرتے ہوئے ٹاؤن میں آ گئے تھے۔ دوسرے کارندے بھی بڑے چوک پر بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ سردارا زندہ باد اور فرمان اکبر مُردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ سلطان بگا انہیں سمجھا رہا تھا کہ وہ سرکاری افسر کے خلاف کسی بھی دشمنی کا مظاہرہ نہ کریں۔ ورنہ سردارا پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا۔

فرمان اسی دن شوکت آباد سے نکل کر ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ اسے بہت صدمہ پہنچ رہا تھا۔ اس نے اپنے اعلیٰ افسر سے پوچھا۔ ”سر! یہ کیا ہو گیا؟ سردارا کو رہائی کیسے مل گئی؟“

اس نے کہا۔ ”ہمارے ملک کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں بے ایمان اور مجرمانہ ذہن رکھنے والے افراد موجود نہ ہوں۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں بھی کچھ ایسے بددیانت افسران ہیں۔ انہوں نے جیدی کو لاک اپ میں ہلاک کرایا ہے اور اس کی فائل غائب کر دی ہے۔“

فرمان نے کہا۔ ”سردارا چار دنوں تک آپ کی کسٹڈی میں رہا۔ آپ اسے ٹارچ سیل میں لے جا کر اقبالِ جرم کرا سکتے تھے۔“

”مجھ سے بھی اوپر افسران ہیں۔ ان میں سے ایک نے سردارا کو اپنی کسٹڈی میں لے لیا تھا اور حکم دیا تھا کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کی جائے۔ ہم سب مجبور ہیں۔ اوپر والوں سے نہ کوئی سوال کر سکتے ہیں' نہ ان کے خلاف کچھ بول سکتے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے' میں دوبارہ ثبوت اور گواہوں کو اکٹھا کرنے کے بعد اسے گرفتار کروں گا تو اسے پھر رہا کرا لیا جائے گا؟ یعنی ہمیں بڑے مجرموں پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ بس چھوٹے موٹے چور اُچکوں کو پکڑ کر اپنا نام اخبارات میں چھپواتے رہنا چاہیے۔“

”سمجھ میں نہیں آتا' فرعونی قوت اور ذرائع رکھنے والوں سے کیسے نمٹا جائے؟“

وہ دو روز تک وہاں رہ کر اعلیٰ افسران سے ملتا رہا۔ سب ہی پریشان تھے۔ یہی کہتے تھے کہ دو یا تین برسوں میں حکومتیں بدل جاتی ہیں۔ آنے جانے والے عارضی حکمران اس مختصر سے عرصے میں جس قدر لوٹ مار کر سکتے ہیں' کرتے ہیں پھر چلے جاتے ہیں۔ اپنے سیاسی غنڈوں کو بھی واردات کرنے اور خوب کمانے کے مواقع دیتے رہتے ہیں۔ ہم محکوم تو تنخواہ دار ملازم ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں' کرنا پڑتا ہے۔

دوسرے دن بشریٰ نے فون کے ذریعے کہا۔ ”ایک اہم اطلاع ہے۔“

اس نے پوچھا۔ ”اگر اہم اطلاع نہ ہوتی تو تم آج بھی فون نہ کرتیں؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے سوچا تھا' فون کروں پھر سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ سے کیا بولوں گی؟“

”تم ایک کال کرتیں۔ مجھے حوصلہ ملتا تو میں خود ہی بولتا چلا جاتا پھر تمہیں بھی بولنا آ جاتا۔“

”اچھی بات ہے۔ آئندہ کوئی کام کی بات نہ ہوئی تب بھی فون کروں گی۔ اب اطلاع سناؤں؟“

”وہ تو سنا دینا... پہلے اپنے بارے میں کچھ بولو۔“

”میں... میں کیا بولوں جی...؟“

”مجھے بھی یاد کرتی ہو؟“

”بھولنے والے کو یاد کرتے ہیں۔ ابا اور بھائی طارق آپ کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ دن میں کئی بار ذکر سنتی ہوں۔ آپ نہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے گھر میں موجود رہتے ہیں۔“

”صرف گھر میں...؟ دل میں نہیں...؟“

وہ ذرا سوچ کر بولی۔ ”آپ تو ہم سب کے دلوں میں رہتے ہیں۔“

”صرف اپنی بات کرو۔“

وہ چپ رہی۔ اس نے کہا۔ ”جواب دو۔“

وہ بولی۔ ”ایسے سوال کا جواب خاموشی ہے۔ آپ جو سمجھنا چاہیں' سمجھ لیں۔ اب کام کی بات کروں؟ بہت ضروری اطلاع ہے۔“

”چلو کام کے بہانے ہی میرے کانوں میں گنگناتی رہو۔“

”میرا خیال ہے' میں اس خفیہ اڈے تک پہنچ گئی ہوں جہاں وہ لوگ چرس' ہیروئن اور افیون کا ذخیرہ رکھتے ہیں۔“

”کیا واقعی...؟ یہ تو تم بہت بڑی خبر سنا رہی ہو۔ اگر ہم وہاں تک پہنچ گئے تو یہ تمہارا بہت بڑا کارنامہ ہو گا۔ اب ذرا تفصیل بتاؤ؟“

وہ بتانے لگی۔ ”ٹاؤن کے جنوب میں غریب مزدوروں کی جھونپڑیاں ہیں۔ اس بستی کے آخری سرے پر لنگڑے لوہار کی جھونپڑی ہے۔ اس کے بعد کھلا میدان اور کھیت ہی کھیت ہیں۔ ایک حادثے میں لنگڑے کا دوسرا پاؤں بھی ناکارہ ہو گیا تھا۔ وہ کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ تب سے سردارا نے اس کی جوان بیٹی شنو کو اپنی داشتہ بنا لیا ہے اور اس کے گھر کے ماہانہ اخراجات پورے کیا کرتا ہے۔“

بشریٰ نے اپنی حکمت عملی سے چند ہی دنوں میں بستی کی ساری عورتوں کو اپنا بنا لیا تھا۔ کوئی اسے بیٹی کہتی تھی' کوئی بہن اور کوئی سہیلی سمجھ کر بڑی بے تکلفی سے باتیں کیا کرتی تھی۔ عورتیں کبھی اس کے گھر آتی تھیں' کبھی وہ وہاں کے گھروں میں جایا کرتی تھی۔ اس طرح شنو سے بھی دوستی ہو گئی تھی۔ ایک روز بشریٰ نے اس سے کہا۔ ”وقت سے پہلے ہی تمہاری جوانی ڈھل جائے گی پھر کیا ہو گا؟ وہ سردارا کیا تمہیں منہ لگائے گا؟“

وہ بولی۔ ”میں تو ڈھل چکی ہوں۔ اب وہ مجھے نہیں پوچھتا۔ پر مہینے کی رقم ضرور دیتا ہے کیونکہ...“

بشریٰ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”کیونکہ اب اس کے ساتھی بشارت' تیمور اور بابے ابلیس مجھے نوچتے کھسوٹتے رہتے ہیں۔“

بشریٰ نے اسے بڑے دکھ سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ”پہلے میں بہت روتی تھی۔ اب مجھ پر قیامت گزرتی رہتی ہے' تب بھی میری آنکھوں میں آنسو نہیں آتے۔ مجھے دیکھو، کیا میں رو رہی ہوں؟“

اس کی آنکھیں خشک اور ویران تھیں۔ بشریٰ نے بڑی محبت اور ہمدردی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا پھر اس ہاتھ کو اپنے سینے سے لگا کر پوچھا۔ ”ان بدمعاشوں کا کبھی دل بھر جائے گا۔ وہ تم سے بے زار ہو جائیں گے، تب کیا ہو گا؟“

”پھر بھی وہ مہینے کی رقم دیتا رہے گا۔“

”شنو! بدمعاش رحم دل نہیں ہوتے۔ وہ خوامخواہ کیوں رقم دے گا؟“

”اس لیے کہ ہم اس کے کارندے ہیں، وفادار ہیں۔ اس کے رازدار ہیں۔“

راز کی بات پر بشریٰ نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”تم اس کی بیوی اور بچوں کی ماں ہوتیں تو وہ تمہیں اپنے دھندے میں ساری عمر رازدار بنا کر رکھتا۔ باسی ہو جانے والی کسی عورت پر وہ ہمیشہ بھروسا نہیں کرے گا۔ تمہیں ٹھکانے لگا کر دوسری لے آئے گا۔“

”میں باسی ہو گئی ہوں۔ پر ہماری یہ جھونپڑی اس کے لیے کبھی کھنڈر نہیں بنے گی۔ ہمارا یہ کچا کوٹھا اس کے لیے تاج محل سے زیادہ قیمتی ہے۔“

”یعنی اس کے لیے تم سے زیادہ تمہارا گھر اہمیت رکھتا ہے؟“

”چھوڑیں اس بات کو... میری حیاتی تو برباد ہو چکی ہے۔ اب نہ میں کسی کی گھر والی بن سکتی ہوں' نہ کبھی ماں بن سکتی ہوں۔“

”تم بیوی بھی بن سکو گی اور ماں بھی... ابھی تو تم جوان ہو۔ میں تمہارا رشتہ کسی سے کرا سکتی ہوں۔“

”سردارا کسی کو میرا شوہر (شوہر) اور رازدار نہیں بننے دے گا۔“

”میں تمہیں اس کے شکنجے سے نکال سکتی ہوں۔“

”یہ اتنا سوکھا (آسان) نہیں ہے۔ تم اسے نہیں جانتیں۔“

”تم سے زیادہ اسے جانتی ہوں۔ ناممکن کو ممکن بنانا آتا ہے۔ اگر تم مجھ پر بھروسا کرو گی، مجھے رازدار بناؤ گی تو میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ تمہیں چپ چاپ اس ٹاؤن سے کہیں دوسری جگہ پہنچا کر تمہارا گھر بسا دوں گی۔“

اس نے بڑے جذبے سے پوچھا۔ ”کیا ایسا ہو سکتا

ہے؟ میں کہیں دور جا کر ان بدمعاشوں سے دور جا کر ایک اچھی زندگی گزار سکتی ہوں؟"

"میں وعدہ کرتی ہوں، تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ سردارا اور اس کے ساتھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ تم کسی شہر میں جا کر اپنے خوابوں اور خیالوں کے مطابق زندگی گزار سکوگی۔ میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کروں گی۔ حکومت کی طرف سے بھی تمہیں انعام و اکرام میں بہت بڑی رقم ملے گی۔"

"مجھے رقم کی پروا نہیں ہے۔ میں لاکھوں روپے حاصل کر سکتی ہوں۔"

بشریٰ نے چونک کر پوچھا۔ "اتنے روپے کہاں سے حاصل کر سکتی ہو؟"

وہ قریب ہو کر اس کی طرف جھک کر سرگوشی میں بولی۔ "وہ ساری چرس اور ہیروئین ہماری جھونپڑی میں چھپا کر رکھتا ہے۔ ابھی تو میں اس مال سے ایک چٹکی بھی لے کر کہیں فروخت نہیں کر سکتی۔ پر یہاں سے فرار ہوتے وقت تھیلی بھر بھر کر لاکھوں روپے کا مال لے جا سکوں گی۔"

"تمہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ قانون کی مدد کروگی تو انعام کے طور پر تمہیں بہت کچھ ملے گا۔"

تب اس نے بتایا کہ اس کی جھونپڑی کے ایک کمرے میں بہت بڑا صندوق ہے۔ اس میں لوہے کا بہت سا ٹوٹا پھوٹا سامان پڑا ہے۔ وہ اتنا بھاری ہے کہ اسے دو تین بندے زور لگا کر وہاں سے ہٹاتے ہیں۔ تب زمین کے نیچے بنے ہوئے گودام میں جانے کا راستہ نظر آتا ہے۔ وہاں پتا نہیں منشیات کا کتنا ذخیرہ رکھا ہوا ہے؟ ضرورت کے وقت سردارا کے خاص کارندے بشارت، تیمور اور بابے ابلیس وہاں سے مال نکال کر لے جاتے ہیں۔

فرمان اور بشریٰ کے درمیان فون کے ذریعے رابطہ رہتا تھا۔ اس روز بھی بشریٰ نے فون پر یہ ساری تفصیلات بتائیں۔ فرمان نے خوش ہو کر کہا۔ "تم نے تو کمال کر دیا۔ اب تک وہاں کئی بار چھاپے مارے گئے ہیں۔ اسکولوں مدرسوں اور فلاحی اداروں... حتیٰ کہ تھانے دار بگا اور تمام سپاہیوں کے گھروں کی بھی تلاشی لی گئی ہے۔ ہم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک اپاہج لوہار کے گھر میں تہ خانہ ہوگا۔ تم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے بشریٰ! آئی لو یو۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "آپ تو کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہے ہیں۔"

"میں تم سے جی بھر کے باتیں کروں گا۔ ابھی جلد سے جلد اس زہریلے ذخیرے تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ اجازت دو پھر کسی وقت رابطہ کروں گا۔"

اس نے فوراً ہی گھر سے نکل کر اینٹی نارکوٹکس فورس کے اعلیٰ افسران سے ملاقات کی۔ ان سے کہا۔ "اس بار میں آپ کے ڈیپارٹمنٹ پر بھروسا کر کے سردارا کو لاکھوں روپے کی چرس اور ہیروئین کے ساتھ گرفتار کرانا چاہتا ہوں۔ کیا یہ کام انتہائی رازداری سے ہو سکے گا؟"

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ "ہم کئی بار کوششیں کر چکے ہیں اور ناکام ہوتے رہے ہیں۔ اگر تم منشیات کے ذخیرے تک پہنچ سکو گے تو ہم انتہائی رازداری سے آپریشن کریں گے اور اس سے پہلے سردارا کو اس کے ساتھیوں سمیت حراست میں لے لیں گے تاکہ وہ جارحانہ انداز میں رکاوٹ نہ بنیں۔"

"وہاں شوکت علی کامرانی کا حکم چلتا ہے۔ آپ انہیں گرفتار کریں گے تو دوسرے ہی لمحے میں کامرانی کے ایک حکم سے انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ آپ ایسا کچھ نہ کریں۔ اچانک چھاپا مارا جائے گا اور جب وہ مال سمیت گرفتار ہوگا تو شوکت علی قانونی معاملات میں مداخلت نہیں کر سکے گا۔"

فرمان اس بار بہت محتاط تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ سردارا گرفتاری کے بعد کسی بھی ہتھکنڈے سے رہائی نہ پا سکے۔ اس نے اعلیٰ افسران سے کہا۔ "وہاں شنو نامی ایک جوان عورت ہے۔ اسے ہر طرح کی سیکیورٹی ملنی چاہیے۔ ہم نے وعدہ کیا ہے کہ اسے سردارا کی دسترس سے دور رکھا جائے گا۔"

بہر حال، بڑی محتاط منصوبہ بندی کے بعد اینٹی نارکوٹکس فورس نے اس جھونپڑی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر شنو اور اس کے اپاہج باپ کو حراست میں لے کر اس تہ خانے تک پہنچ گئے جہاں لاکھوں روپے کی منشیات چھپا کر رکھی گئی تھی۔ یہ سردارا کی خوش بختی تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دوسرے علاقے میں گیا ہوا تھا اور ایک بہت بڑی کامیابی کے باوجود گرفت میں نہیں آ سکا تھا۔

اس کے کارندے نے آ کر خطرے سے آگاہ کیا۔ سردارا نے بے یقینی سے پوچھا۔ "انہیں یہ راز کیسے معلوم ہوا کہ ہمارا مال اس جھونپڑی میں چھپایا جاتا ہے؟"

"پتا نہیں، وہ لوگ شنو اور اس کے باپ کو گرفتار کر کے کہیں لے گئے ہیں۔"

بابے نے کہا۔ "لکھ لعنت اے... ان باپ بیٹی میں سے کسی ایک نے یہ بھید کھولا ہے۔"

بشارت نے کہا۔ "جو آج تک نہ ہوا، وہ اچانک کیسے ہو گیا؟ فرمان کوئی جادوگر نہیں ہے۔ ہمیں معلوم کرنا چاہیے۔ اسے وہاں تک کس نے پہنچایا ہے؟"

سردارا اپنے ساتھیوں کے ساتھ روپوش ہو گیا تھا۔ شوکت علی نے کہا۔ "اس علاقے میں نہ آنا۔ قانون کی گرفت میں آؤ گے تو ضمانت نہیں ہو سکے گی۔"

وہ بولا۔ "اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ پکڑا جانے والا مال میرا ہے۔ آپ قانون کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ مجھے الزام سے بری کرا سکتے ہیں۔"

"معاملہ سنگین ہے۔ شنو اور اس کے باپ نے بیان دیا ہے کہ تم اس تہ خانے میں مال چھپا کر رکھتے تھے پھر یہ کہ ہماری حکومت گر گئی ہے۔ فوج آ گئی ہے۔ پتا نہیں اسمبلیاں برقرار رہیں گی یا نہیں...؟ میری وزارت کے سلسلے میں بھی آئندہ معلوم ہوگا۔"

سردارا نے اپنے چند ساتھیوں سے کہا۔ "ہم بڑے وقت میں دربدر ہوئے ہیں۔ اگر پکڑے گئے تو فوجی ہمیں الٹا لٹکا کر ایسی پھینٹیاں لگائیں گے کہ ہم خود ہی اپنا کچا چٹھا کھول کے رکھ دیں گے۔"

بابے نے کہا۔ "فرمان اکبر نوں اے یقین اے کہ دارا شکوہ کو ہم نے قتل کیا ہے۔ وہ ٹارچ سیل میں اس جرم کا بھی اقرار کرا لے گا۔"

وہ چاروں اپنے دھندے سے ٹوٹ کر اپنے علاقے سے چھوٹ کر بے یار و مددگار ہو گئے تھے۔ اگر دربدر ہو جانے والی بات پہلے سے معلوم ہوتی تو وہ تہ خانے سے اپنا مال ضرور لے آتے جسے بیچ کر آسانی سے گزارہ کرتے رہتے۔ اب تو کسی دوسرے شہر کی طرف جانے سے گرفتار ہونے کا اندیشہ تھا۔ وہ جلد ہی فاقے کرنے والے تھے۔

انہیں ایک کارندے نے آ کر بتایا کہ شنو آج کہیں سے فرمان کے ساتھ آئی ہے۔ بڑی خوش ہے۔ سرکار کی طرف سے اسے دو لاکھ روپے ملے ہیں۔ وہ کسی دوسرے علاقے میں رہنے کے لیے جا رہی ہے۔

سردارا نے ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ "اسی کتیا نے ہم سے غداری کی ہے۔ معلوم کرو وہ کس علاقے میں جا کے مرے گی؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس مخبر نے کہا۔ "صرف شنو نے نہیں، سلامت علی کی بیٹی بشریٰ نے بھی مخبری کی ہے۔ میری گھر والی کہہ رہی تھی کہ بشریٰ فرمان کی معشوقہ ہے۔ اب تک اس کے لیے مخبری کرتی رہی اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔"

بابے ابلیس نے کہا۔ "فرمان نے بڑا لمبا چکر چلایا ہے۔ سردارا! پہلے تم نے بشریٰ کو گھر والی بنانا چاہا پھر اسے دیکھ کر کامرانی صاحب کی رال ٹپکنے لگی۔ ان کی خاطر تم نے دارا کو قتل کیا۔ پر نہ تو وہ ان کے ہاتھ لگی نہ تیرے ہاتھ آئی۔ سالا وہ سی آئی اے والا مزے لوٹ رہا ہے۔"

سردارا مٹھیاں بھینچ رہا تھا، دانت پیس رہا تھا۔ اس نے عادتاً ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ سکول میں پڑھنے والی لڑکی ہم سب کو ٹھینگا دکھائے گی اور ہمیں اس جنجال میں ڈالے گی۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی بوٹی بوٹی سے حساب لوں گا۔ ہم سب مل کر اس کی دھجیاں اڑائیں گے۔ پھر اس کی لاش فرمان کے لیے چھوڑ کر یہاں سے چلے جائیں گے۔"

تیمور نے کہا۔ "ابھی تو دال روٹی کی سوچ۔ آج رات نہ کھانا ہے... نہ شراب ہے۔"

"ہم سوچنے کے لیے نہیں، چھیننے جھپٹنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ آج رات چودھری شمشاد کی حویلی میں ڈکیتی ڈالیں گے۔"

وہ موجودہ حالات میں اسی طرح گزارہ کر سکتے تھے۔ رات کی تاریکی پھیلتے ہی وہاں سے چل پڑے۔ تقریباً چالیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے آدھی رات کو حویلی میں پہنچے۔ انہوں نے وہاں کے چوکیدار اور ملازموں کو نشانے پر رکھ کر انہیں بے بس کیا۔ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ پھر حویلی میں گھس کر چودھری کی خواب گاہ میں پہنچ گئے۔ اسے اور چودھرائن کو بھی قابو میں کر لیا۔

چودھری نے کہا۔ "سردارا! تو جانتا ہے، شوکت علی کامرانی میرا بہنوئی ہے۔ پھر بھی تو ڈاکو بن کے آیا ہے۔ مجھ سے بول... کیا چاہتا ہے۔ میں خود تجھے دوں گا۔"

وہ بولا۔ "مانگنے سے مٹھی دو مٹھی ملے گی، پر چھیننے سے پوری تجوری ملے گی۔ وقت برباد نہ کر۔ فوراً تجوری کھول۔"

اس نے سیف کے پاس آ کر اسے کھولا۔ زیورات کے علاوہ نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ سامنے ہی بھرا ہوا پستول رکھا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اسے اٹھاتے ہوئے گولی چلائی۔ پہلا نشانہ تیمور بنا، دوسرے کو نشانہ بنانے سے پہلے ہی ایک گولی اس کے سینے میں آ کر پیوست ہو گئی۔ اس نے تیمور کی لاش کے قریب گرتے ہی دم توڑ دیا۔

سردارا کو اپنے ساتھی کی موت کا افسوس تھا مگر وہ ماتم کرنے میں وقت ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ تجوری کے زیورات اور نقدی بیگ میں بھر کر چودھرائن سے بولے۔ "ہمارے ساتھ باورچی خانے میں چلو۔ جو پکایا ہے، وہ نکال کے لے آؤ۔"

وہ چودھری کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

ان کے ساتھ کچن میں آ کر ان کی دعوت کرنے لگی۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔ ''مجھے جان سے تو نہیں مارو گے؟ تم جو کہو گے وہ کرتی رہوں گی۔ تمہارے جانے کے بعد تھانے میں بھی بیان نہیں دوں گی۔''

بابے نے کہا۔ ''چودھری نشہ کرتا تھا۔ ادھر بوتلیں ضرور ہوں گی؟''

''میں نے کہا نا... جو مانگو گے وہ دوں گی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ رب دا واسطہ... جلدی چلے جاؤ۔''

اس نے ایک الماری کھولی۔ اس میں شراب کی بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر تینوں کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ پینے اور کھانے لگے۔ مجبوری تھی، تمام بوتلیں اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے۔ پھر بھی جتنا وزن اٹھا سکتے تھے، واپسی پر اٹھا لائے۔ چودھرائن کو رسیوں سے باندھ کر آئے تاکہ وہ فوراً ہی پولیس کو انفارم نہ کر سکے۔

دوسرے دن شوکت علی نے فون پر کہا۔ ''سردارا! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تم نے میرے سالے کو قتل کیا ہے اور اس کی تجوری بھی صاف کر دی ہے؟''

وہ بولا۔ ''آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ چودھری کے ساتھ ہمارے ایک وفادار ساتھی کی لاش ملی ہے؟ میں نے حساب برابر کیا ہے۔ اگر آپ شکایت کرو گے کہ میں نے آپ کے ایک قریبی رشتے دار کو مار ڈالا ہے تو مجھے بھی شکایت ہے، آپ مجھے قانون کے شکنجے سے نکالنے کے لیے کچھ نہیں کر رہے ہو۔ ہم بھوکے نہیں رہ سکتے۔ بھیک نہیں مانگ سکتے۔ واردات نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟''

''تم جانتے ہو، میں تمہاری سلامتی کو اپنی سلامتی سمجھتا ہوں۔ تم پکڑے گئے تو اپنے باپ کو بھی نہیں چھوڑو گے۔ میرے خلاف خوب بولو گے۔ ابھی حالات ایسے ہیں کہ تمہارے لیے کچھ کر نہیں پا رہا ہوں۔''

''آخر کب تک ایسے حالات رہیں گے؟''

''یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے، تمہیں اس ملک سے باہر بھیج دوں۔ جب حالات بہتر ہوں گے تو واپس بلا لوں گا۔''

''میں یہاں سے ہائی وے کی طرف نہیں جا سکتا۔ سارے شہروں کے ائرپورٹ پر میری تصویریں پہنچائی گئی ہیں اور پھر میرا پاسپورٹ ڈیرے پر رکھا ہوا ہے۔ میں ملک سے باہر کیسے جا سکتا ہوں؟''

''تم کراچی کے ساحل سے ایک لانچ کے ذریعے مڈل ایسٹ جاؤ گے۔ وہاں تمہیں نیا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات ملیں گے۔ میں سارے انتظامات کر رہا ہوں۔ دو چار دنوں میں سلطان بگا گاڑی لے کر آئے گا اور تمہیں کراچی لے جائے گا۔''

''جناب عالی! سلطان بگا نہیں، آپ خود مجھے کراچی لے جاؤ گے۔''

''کیا بکواس کرتے ہو؟ میرے پاس ہائی وے سے سفر کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں بہت مصروف ہوں۔''

''او جی! صرف میری نہیں، آپ کی بھی سلامتی کا تقاضا ہے۔ ساری مصروفیات ختم کرو۔ آپ کی گاڑی پر پاک پرچم لہراتا رہتا ہے۔ میں اس میں چھپا رہوں گا تو کوئی اسے روک کر چیک نہیں کرے گا۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکوں گا۔''

''پھر تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔ کہیں جا کر حرام موت مرنے سے بہتر ہے، اپنے ساتھیوں کے ساتھ جیتا رہوں یا مرتا رہوں۔ جب گرفتاری ہوگی اور ڈوبنے کا وقت آئے گا تو آپ کو بھی لے ڈوبوں گا۔ آپ اچھی طرح سوچ لو۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ شوکت علی نے جھنجھلا کر ریسیور رکھتے ہوئے بگا کو دیکھا پھر کہا۔ ''اس کتے نے فون بند کر دیا ہے جیسے میں اس کا محتاج ہوں۔ ایسی چھوٹی ذات کے لوگوں کو اپنا رازدار نہیں بنانا چاہیے۔''

بگا نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ اس کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ وہ جلد ہی حرام موت مرے گا۔''

''پتا نہیں کب مرے گا؟ مجھے رپورٹ مل رہی ہے، اسے جلد ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ اگر وہ پکڑا گیا تو میری نیندیں حرام ہو جائیں گی۔''

''آپ اطمینان رکھو۔ میں گرفتاری سے پہلے ہی اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔''

''وہ تمہارے ساتھ نہیں، میرے ساتھ کراچی جانا چاہتا ہے۔''

''آپ راضی ہو جائیں۔ حقیقتاً ہمیں کراچی نہیں جانا ہے۔ بس ایک بار اس سے سامنا ہو جائے، وہ جہاں ملے گا وہیں گولی مار دی جائے گی۔''

وہ بگا کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ''مجھ پر بھروسا کریں۔ ہمارے ساتھ پکے نشانے باز سپاہی ہوں گے۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''کاؤنٹر فائرنگ ہوگی تو گولی مجھے بھی لگ سکتی ہے۔''

''ہم ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ پہلے دوستانہ رویہ رکھیں گے۔ پھر موقع پا کر اسے نہتا کرنے کے بعد گولی چلائیں گے۔''

وہ اس معاملے کے ہر پہلو پر غور کرنے لگا پھر بولا۔ ''کل صبح اسلام آباد جا رہا ہوں۔ دوسرے دن واپس آ جاؤں گا۔ پرسوں شام کو وہ جہاں بھی ہے، وہاں اس کا کام تمام کرنے جائیں گے۔''

''آل رائٹ سر! پرسوں وہ مصیبت آپ کے سر سے ٹل جائے گی۔''

کامرانی نے ریسیور اٹھا کر نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ''ہیلو سردارا! میں نے تمہارے مطالبے پر غور کیا ہے۔ تم درست کہتے ہو۔ میری گاڑی میں سفر کرو گے تو نہ چیکنگ ہوگی نہ تمہاری گرفتاری کا اندیشہ رہے گا۔''

''بڑی مہربانی جناب! اس طرح آپ اعتماد قائم کر رہے ہیں۔ یہ بتائیں، کب آ رہے ہیں؟''

''میں پرسوں شام سلطان بگا اور سپاہیوں کے ساتھ آؤں گا۔ یہ بتاؤ، تم کہاں ہو؟''

''جب آپ وہاں سے روانہ ہوں گے، تب بتاؤں گا۔ برا نہ مانیں، میں ذرا محتاط رہنا چاہتا ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔ میں پرسوں فون کروں گا۔''

شوکت علی کامرانی نے ریسیور رکھ کر کہا۔ ''بہت چالاک بن رہا ہے۔ ہمیں پرسوں اپنے خفیہ اڈے کے بارے میں بتائے گا۔ تم پوری طرح تیار رہو۔''

سردارا کا ایک ساتھی مارا گیا تھا۔ اب دو رہ گئے تھے۔ وہ فون پر ہونے والی باتیں سنتے رہتے تھے۔ انہوں نے مایوس ہو کر سردارا سے پوچھا۔ ''کیا تم ہمیں چھوڑ کر ملک سے باہر چلے جاؤ گے؟''

اس نے پوچھا۔ ''تمہارا دل کیا کہتا ہے؟''

انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سردارا نے کہا۔ ''تم سب میرے لیے جان کی بازی لگاتے رہے۔ کیا میں اپنی جان بچانے کے لیے تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا جاؤں گا؟''

بابے نے کہا۔ ''ساڈا دل کہتا ہے، تم ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ پر ہم سمجھتے ہیں فی الحال تمہیں گرفتاری سے بچنے کے لیے جانا چاہیے۔ جب حالات سازگار ہوں گے تو واپس آ جانا۔''

وہ ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''ہم ایک ساتھ جئیں گے، ایک ساتھ مریں گے۔ اگر جاؤں گا تو تم دونوں کے ساتھ... ورنہ جانے سے انکار کر دوں گا۔''

وہ دونوں خوش ہو کر اس سے لپٹ گئے۔ دوسرے دن مخبر نے آ کر کہا۔ ''فرمان کے ساتھ جتنے سپاہی اور افسران لاہور سے آئے تھے، وہ سب واپس چلے گئے ہیں۔''

بابے نے پوچھا۔ ''کیا فرمان بھی چلا گیا ہے؟''

''ہاں۔ اب ہمارے ٹاؤن میں صرف بگا اور اس کے سپاہی ہیں۔''

بشارت نے کہا۔ ''فرمان تو بشریٰ کا یار ہے۔ اسے چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ دیکھ لینا... دوسرے ہی دن واپس آئے گا۔''

سردارا نے کہا۔ ''دوسرا دن ابھی دور ہے۔ آج کھلی چھٹی ہے۔ ہم بشریٰ کو اٹھا کے لا سکتے ہیں۔''

بشارت نے کہا۔ ''فرمان کے ماتحت وہاں ہوں گے۔''

مخبر نے کہا۔ ''کوئی نہیں ہے۔ سب جا چکے ہیں۔ وہ سمجھ گئے ہیں، تم لوگ کبھی واپس نہیں آؤ گے۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے سرحدی علاقے میں چلے گئے ہو۔ میں نے تھانے دار کو بھی یہی کہتے سنا ہے۔''

بابے نے کہا۔ ''یعنی ساڈے واسطے راستہ صاف اے۔ تھانے دار نے بھی لوگوں کو یقین دلایا ہے کہ ہم ادھر نہیں ہیں۔ بشریٰ کو چپکے سے لائیں گے تو کوئی ہم پر شبہ نہیں کرے گا۔''

انہوں نے طے کیا کہ آدھی رات کو بشریٰ کے گھر میں گھس کر اسے اٹھا لیا جائے گا اور مزاحمت کرنے والے باپ بھائی کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔ وہ وہاں اپنے خلاف کوئی ثبوت چھوڑ کر نہیں آئیں گے۔

پچھلی رات شوکت علی کو فون پر اطلاع دی گئی تھی کہ اسلام آباد میں ہونے والی میٹنگ ملتوی کر دی گئی ہے۔ وہاں جانا ضروری نہیں تھا۔ وہ دوسری صبح اپنی کار میں بیٹھ کر علاقے کا دورہ کرنے نکلا تو اس وقت ٹاؤن کے طلبا اور طالبات اسکول جا رہے تھے۔ بشریٰ اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ ہنستی بولتی جا رہی تھی۔ شوکت علی کامرانی نے اس کے قریب آ کر گاڑی روکی۔ اسے مخاطب کیا۔ ''بشریٰ! جسٹ آ منٹ... میری بات سنو۔''

وہ سہیلیوں کے جھرمٹ سے نکل کر اس کے پاس آ گئی۔ اسے دیکھ کر دل مچلنے لگا تھا۔ اس نے اپنے حالات سے مجبور ہو کر پچھلے دنوں اسے نظر انداز کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کے دل و دماغ سے ایک لمحے کے لیے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔

اس نے کہا۔ ''میں تمہارے ابا سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟''

اس نے مختصر سا جواب دے کر جانا چاہا۔ ''وہ گھر میں ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''ہوا کے گھوڑے پر سوار نہ رہو۔ ذرا میری بات تو سنو۔''

وہ علاقے کا جاگیردار تھا۔ وہ بات کرنے سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ دور و نزدیک آنے جانے والے افراد رک گئے تھے۔ جو دکانوں کے اندر اور باہر بیٹھے تھے، وہ ادب سے کھڑے ہو گئے تھے۔ بشریٰ نے ایک قدم آگے بڑھ کر پوچھا۔ ''فرمائیں...؟''

کامرانی نے پوچھا۔ ''میں نے تمہارے اور فرمان اکبر کے متعلق کچھ افواہیں سنی ہیں۔ یہ کہاں تک درست ہیں؟''

''افواہوں پر بے وقوف اور ناخواندہ لوگ کان دھرتے ہیں۔ آپ تو ایجوکیٹڈ ہیں۔''

''یعنی یہ غلط ہے؟''

''میں آپ کو جواب دے چکی ہوں۔ پھر یہ کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ ایسا کوئی سوال نہ کریں۔''

وہ مسکرا کر موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ''آج کے بعد یہ تمہارا ذاتی معاملہ نہیں رہے گا۔ میں تمہارا رشتہ مانگنے جا رہا ہوں۔ تمہارے ابا تمہیں چودھرائن بنانے سے انکار نہیں کریں گے۔''

وہ ہنستا ہوا کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے جانے لگا۔ بشریٰ اسے غصے سے دیکھتی رہی۔ پھر اسکول بیگ سے موبائل فون نکال کر فرمان سے رابطہ کرنے لگی۔ کامرانی سوچ رہا تھا کہ فرمان اور بشریٰ کے متعلق جو افواہیں گردش کر رہی ہیں، ان میں صداقت نہیں۔ وہ اسے سنجیدگی سے اپنی دوسری شریک حیات بنانا چاہتا تھا۔

سلامت علی نے اسے دیکھ کر سلام کیا پھر کہا۔ ''آپ نے کیوں میرے دروازے پر آنے کی زحمت کی... ہم تو حکم کے بندے ہیں، حاضری دینے آپ کے در پر چلے آتے۔''

وہ کار سے اترتے ہوئے بولا۔ ''بڑی پرانی کہاوت ہے کہ پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے۔ میں پیاسا ہوں... اس لیے آیا ہوں۔''

وہ سلامت علی کے ساتھ چھوٹی سی بیٹھک میں آ کر بیٹھ گیا پھر بولا۔ ''میری بیوی ان پڑھ جاہل عورت ہے۔ چچا کی بیٹی تھی۔ اس کی جائیداد سنبھالنے کے لیے شادی کر لی۔ پر میں اپنی پھیلی ہوئی جائیداد کو سنبھالنے کے لیے ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جو دوسری آئے گی، وہی میری دولت اور جائیداد سے کھیلتی رہے گی۔ ساری حیاتی عیش کرتی رہے گی۔''

سلامت علی نے کہا۔ ''اور آپ کے بچے؟''

''ان کا کیا ہے؟ لندن میں پڑھ لکھ رہے ہیں۔ ان کے نام تھوڑی سی جائیداد لکھ دوں گا۔ میری دوسری بیوی سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔''

''پھر تو آپ دوسری شادی کرنے کا حق رکھتے ہیں... ضرور کریں۔''

''اسی لیے آپ کے دروازے پر آیا ہوں۔''

سلامت علی نے کہا۔ ''جب آپ نے بات شروع کی تھی، میں تب ہی سمجھ گیا تھا کہ راجہ بھوج ہم جیسے گنگو تیلی کے گھر کیوں آیا ہے؟''

''او نا جی نا! آپ خود کو گنگو تیلی نہ کہیں۔ میں آپ کو اپنے برابر کا سمجھ کر رشتہ مانگنے آیا ہوں۔''

''پر اس کا رشتہ تو ہو چکا ہے۔''

اس نے چونک کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ''وہ بات تو ختم ہو چکی ہے۔ جس سے ہوا تھا، وہ مر چکا ہے۔''

''ہماری برادری میں جوان اور قابل لڑکوں کی کمی نہیں ہے۔''

''بے شک، کمی نہیں ہوگی... پر میری طرح کوئی دولت مند بلند مرتبے والا نہیں ہوگا۔''

''جسے لڑکی چاہے، اس کا مرتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ میں اپنی دھی رانی کی پسند کے مطابق سی آئی اے کے افسر فرمان اکبر سے اس کا رشتہ کرنے والا ہوں۔ آپ اس بات کو یہیں ختم کر دیں۔''

فرمان کا نام سن کر کامرانی کے ذہن کو ذرا جھٹکا سا لگا۔ وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا پھر بولا۔ ''آپ نے دنیا دیکھی ہے۔ لڑکی کی پسند نہ دیکھیں۔ وہ تو نادان ہے۔''

''آپ اپنی پہلی بیوی کو بھی بے وقوف کہہ چکے ہیں۔ میری بیٹی بھی بے وقوف اور نادان ہے۔ آپ یہاں رشتہ کرنے کی غلطی نہ کریں۔ اپنے برابر والوں میں جائیں۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں جا رہا ہوں اور آپ کی بہتری کے لیے سمجھا رہا ہوں کہ مجھے جنوائی بنا لیں۔ ہر طرح سے فائدے میں رہیں گے۔''

وہ اپنی تذلیل محسوس کر رہا تھا۔ غصے کو چھپانے کے باوجود پاؤں پٹختا ہوا باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے فون پر بگا سے بولا۔ ''میں کوٹھی میں ہوں، فوراً آؤ۔''

وہ حکم سنتے ہی تھانے سے نکل کر گاڑی دوڑاتا ہوا کوٹھی میں پہنچ گیا۔ کامرانی غصے سے ٹہل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بولا۔ ''میں نے سردارا کو بشریٰ کی عزت لوٹنے سے باز رکھا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے دارا شکوہ کو قتل کرایا پھر بھی سالی ہاتھ نہیں آ رہی ہے۔''

بگا نے سر ہلا کر کہا۔ ''پورے علاقے میں چرچا ہو رہا ہے، وہ فرمان کی منگ ہے۔ آپ نے فرمایا تھا اسے اپنی شریک حیات بنائیں گے۔ پر اپنے عاشق کے پیچھے بدنام ہونے والی سے کیا اب آپ شادی کرنا چاہیں گے؟''

''اب میں اس کی عزت پر تھوکنا چاہتا ہوں۔ اس کے باپ نے میری توہین کی ہے۔ کچھ بھی کرو، اس کتیا کو اٹھا کے میری شکارگاہ میں لے آؤ۔''

بگا سر جھکا کر سوچنے لگا۔ شوکت نے کہا۔ ''کل سردارا کو بھی ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ تم نے کہا تھا اس کی جگہ ایک بہت ہی شاطر غنڈے کو تیار کیا گیا ہے۔ یہ اسے آزمانے کا وقت ہے۔ کیا وہ بشریٰ کو اغوا کر سکے گا؟''

''جی جناب عالی! وہ بڑی بڑی وارداتیں کر چکا ہے۔ کالوا اردواتیا ہے۔ میں یہی سوچ رہا ہوں۔ فرمان اور اس کے ماتحت یہاں ہیں۔ اگر آج بشریٰ کو اٹھایا جائے گا تو اس کا الزام سردارا پر آئے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ الزام سے انکار کرے، ہم اسے جہنم میں پہنچا دیں گے۔''

شوکت علی نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''یہی ہونا چاہیے۔ آج کسی بھی وقت بشریٰ کو اٹھاؤ اور کل سردارا سے پیچھا چھڑاؤ۔ میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر جائے گا۔ تمہیں ہر مہینے پچیس ہزار روپے ملتے رہتے ہیں۔ اس بار ایک لاکھ روپے دوں گا۔''

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کا خادم ہوں جناب عالی! سمجھیں... کام ہو گیا۔ میں فون پر اطلاع دوں گا، آپ شکارگاہ میں چلے آئیں۔''

وہ غلام تھانے دار ایک نئے مشن کی تکمیل کے لیے وہاں سے چلا گیا۔ کامرانی قد آدم آئینے کے سامنے آ کر خود کو دیکھنے لگا۔ کچھ بوڑھا سا لگ رہا تھا۔ وہ سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اندر ایک گیت گونجنے لگا۔ ابھی تو میں جوان ہوں...

جب تک ہستی میں مستی رہے اور مستی کے لیے کم سن دوشیزائیں ملتی رہیں، تب تک کوئی عیاش خود کو بوڑھا تسلیم نہیں کرتا۔ وہ موچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا۔

☆☆☆

رات کے نو بجے طارق اور سلامت علی روٹی کھانے کے بعد سونے جا رہے تھے۔ ایک سپاہی نے آ کر انہیں آواز دی۔ طارق نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

وہ بولا۔ ''ابھی تمہاری اور سلامت چاچا کی حاضری ہے۔ بگا صاحب نے بلایا ہے۔''

اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''اتنی رات کو...؟ معاملہ کیا ہے؟''

''وہی نجو کے گھر والا معاملہ ہے۔ آگے میں نہیں جانتا۔ خود ہی جا کے معلوم کرو۔ ابھی فوراً چلو۔''

''ٹھیک ہے۔ ابا کا جانا ضروری نہیں ہے، میں چلتا ہوں۔''

''او تم سے کہا نا... دونوں کی حاضری ہے۔ بحث نہ کرو، دونوں ابھی چلو۔''

سلامت نے کہا۔ ''چل پتر! چل کے دیکھتے ہیں، تھانے دار یہاں کا بے تاج بادشاہ ہے۔ حکم تو ماننا ہی پڑے گا۔''

انہوں نے بشریٰ کو تاکید کی کہ دروازہ اندر سے بند رکھے۔ کوئی پوچھنے آئے تو کہہ دے وہ دونوں تھانے میں ہیں۔

وہ باپ بیٹا وہاں سے تھانے پہنچ گئے۔ سلطان بگا نے کہا۔ ''آؤ جی آؤ! کسی مجرم کو کرسی پر بٹھایا نہیں جاتا۔ پر تم بزرگ ہو، عزت دار ہو۔ آؤ بیٹھو۔''

وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سلامت نے پوچھا۔ ''مجھے مجرم کیوں کہہ رہے ہو؟ نجو کے گھر واردات کرانے والا سردارا تو پکڑا گیا تھا؟''

وہ بولا۔ ''یہی تو بات ہے جی! سردارا کے خلاف کوئی ثبوت یا گواہ نہیں تھا۔ وہ چھوٹ کر آ گیا تھا۔ اب تو نجو اور اس کی ماں کے بیان کے مطابق تم ہی مجرم ہو۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اصل مجرم کو چھوڑ دیا گیا، اب پھر مجھے پھانسا جا رہا ہے۔''

''ہم نہیں پھانس رہے ہیں۔ عدالت میں ان کا بیان تسلیم کیا جائے گا جن پر ظلم ہوا ہے۔''

''آپ نجو اور اس کی ماں کو بلاؤ۔ وہ میرے خلاف نہیں بولیں گی۔''

طارق نے کہا۔ ''ابا! تم نے کبھی نجو کے سر پر محبت اور ہمدردی سے ہاتھ نہیں رکھا۔ وہ بھی تمہارے حق میں نہیں بولے گی۔''

سلامت علی نے بیٹے سے کہا۔ ''تو پھر اس بات پر آ رہا ہے کہ میں اس سے ہمدردی کروں۔ اسے اپنی نوں (بہو) بنا لوں۔''

اس بات پر دونوں باپ بیٹے میں، تو تو میں میں،

ہونے لگی۔ بگا نے کہا۔ ''او بزرگو! عقل سے کام لو۔ بیٹا اس کا دیوانہ ہے اور وہ دیوانہ بنانے والی آپ کو الزام سے بری کرا سکتی ہے۔''

سلامت علی نے پریشان ہو کر کہا۔ ''میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ دو چار برسوں کی سزا ہو گی تو جیل چلا جاؤں گا۔ پر جس کی عزت نہیں ہے' اسے اپنے خاندان کی عزت نہیں بناؤں گا۔''

''ابا! بڑھاپے میں تیری مت ماری گئی ہے۔ تُو دو برسوں کے لیے بھی جیل جائے گا تو میں نجو سے بیاہ کر لوں گا۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہو گا۔ تیرے واپس آنے تک بچے بھی ہو جائیں گے۔''

اس بات پر سلامت علی بھڑک گیا۔ کرسی سے اٹھ کر بولا۔ ''میں تجھے گھر سے نکال دوں گا۔ برادری والے بھی تجھ پر تھوکیں گے۔''

''وہ تب بھی تھوکیں گے جب تُو مجرم کہلائے گا اور قید بامشقت کی سزا پائے گا۔''

بگا نے کہا۔ ''عقل تو یہی کہتی ہے' نجو کو بہو بنا کر اس کا منہ بند کرو اور عزت سے رہو۔''

تھانے دار سمجھ گیا تھا کہ وہ بوڑھا کبھی نجو کو بہو نہیں بنائے گا۔ اس لیے وہ باپ بیٹے میں لڑائی کروا کر ٹائم پاس کر رہا تھا۔ دو گھنٹے بعد ہی ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے بگا سے کہا۔ ''سر! سلامت چاچا کے گھر واردات ہوئی ہے۔ ڈاکو وہاں گھس آئے تھے۔ وہ بشریٰ کو اٹھا کے لے گئے ہیں۔''

یہ سنتے ہی دونوں باپ بیٹے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں سے دوڑتے ہوئے جانے لگے۔ بگا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کیپ پہنتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چلیں... اب ضابطے کی کارروائی کریں۔ محلے پڑوس والوں کے بیانات لیں۔ دو چار کو مشکوک بنا کر حوالات میں بند کریں۔ ہم تو خدمت گزار ہیں۔ یہی کر سکتے ہیں۔''

وہ تھانے سے باہر آ کر سپاہیوں کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ فون کے ذریعے اس غنڈے سے رابطہ کیا جسے سردارا کی جگہ استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کام ہو گیا؟''

''آہو جناب! اسے شکار گاہ میں پہنچا دیا گیا ہے۔''

''واردات کے دوران کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟''

''اونہ جناب! ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ چیخے گی' چلائے گی... پر اس نے بندوق کے سامنے چپ چاپ ہاتھ پاؤں بندھوا لیے۔ بس ایک دروازہ توڑ کر اندر گھسنے میں تھوڑا وقت لگا تھا۔ ہم نے فائرنگ کی تو کوئی مقابلے پر نہیں آیا۔''

''شاباش! اکامرانی صاحب خوش ہو جائیں گے۔ تمہیں انعام دیں گے۔ میں انہیں اطلاع کر رہا ہوں۔ وہ کسی بھی وقت وہاں آ سکتے ہیں۔''

اس نے فون بند کیا پھر نمبر پنچ کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر کہا۔ ''جنابِ عالی! کام ہو چکا ہے۔ آپ کی چیز شکار گاہ میں پہنچ گئی ہے۔ آپ وہاں کب تک جائیں گے؟''

''تم کہاں ہو؟''

''میں تو بشریٰ کے گھر والوں سے ہمدردی کر رہا ہوں۔ اپنے طور پر تفتیش کرنے جا رہا ہوں۔ ان سے نمٹنے کے بعد حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ اطمینان سے جائیں۔ ہمارے مسلح بندے سادہ لباس میں وہاں پہرا دے رہے ہیں۔''

ابھی معاملات الجھنے والے تھے۔ سردارا جو واردات کرنے والا تھا' وہ پہلے ہو چکی تھی۔ آدھی رات کو وہ دونوں ساتھیوں کے ساتھ ادھر آیا تو ٹاؤن کے باہر ہی اس کے مخبر نے کہا۔ ''کدھر جا رہے ہو؟ تمہاری چڑیا اڑ چکی ہے۔ بستی میں سب ہی لوگ جان گئے ہیں کہ چار ڈاکو آئے تھے، وہ بشریٰ کو اٹھا کے لے گئے ہیں۔''

اس نے حیرانی اور بے یقینی سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہا ہے؟ ہمارے سوا ایسی واردات کرنے کی جرأت کون کرے گا؟''

وہ بولا۔ ''سب یہی کہہ رہے ہیں' بشریٰ کو تم لے گئے ہو۔ تھانے دار بگا بھی یہی کہتا ہے۔''

''وہ تو دوغلا ہے۔ اپنے باپ کا نہیں ہے... میرا کیا ہو گا؟''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے تمہارے قریب کارندوں کو گرفتار کر رہا ہے۔''

بابے انیس نے کہا۔ ''سردارا! یہ تو ہم جیسے بدمعاش جانتے ہیں کہ تھانے دار کی سرپرستی کے بغیر اس کے علاقے میں کوئی واردات نہیں ہوتی۔ اس کم بخت کو معلوم ہو گا کہ بشریٰ کو کون لے گیا ہے؟''

وہ سوچتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ ''یہ کیا چکر ہے؟ جسے ہم اڑانا چاہتے تھے، اسے کوئی دوسرا اڑا کے لے گیا ہے۔ ہمارے ٹاؤن میں کئی خوبصورت کڑیاں ہیں۔ پھر بشریٰ ہی کو کیوں اٹھایا گیا ہے؟''

وہ بابے کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''تُو ٹھیک کہتا ہے۔ اس کمینے تھانے دار سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بشریٰ ابھی کہاں ہو گی؟''

بشارت نے پوچھا۔ ''تے فیر کی ارادے نیں...؟''

سردارا نے کہا۔ ''میں ان کے ارادے اچھی طرح سمجھ

گیا ہوں۔ کامرانی صاب بھی میری گرفتاری نہیں چاہیں گے۔ ایسا ویلا! آنے سے پہلے ہی مجھے مار ڈالیں گے اور وہ یہ کام بگا سے لیں گے۔"

وہ چپ ہوکر سوچنے لگا۔ بابے نے کہا۔ "بگا نہیں رہے گا تو کامرانی صاب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ تم سے خوف زدہ رہیں گے۔"

"آہو! اصل چیز خوف ہے۔ شیر بھی نرغے میں آجائے تو خوف کے مارے جھاڑیوں میں چھپتا پھرتا ہے۔ ہم بھی چھپتے پھر رہے ہیں۔ کامرانی صاب کی بھی یہی حالت ہوگی۔"

اس نے مخبر سے کہا۔ "تو تھانے کی طرف جا۔ میں کامرانی صاب کی کوٹھی کے سامنے کہیں چھپا رہوں گا۔ بگا ادھر آئے گا تو اس سے نمٹ لوں گا۔ اگر وہ تھانے میں آئے تو مجھے خبر دینا۔ وہی "میں بشریٰ کے بارے میں بہت کچھ بتا سکے گا۔"

مخبر وہاں سے چلا گیا۔ سردارا اپنے ساتھیوں کے ساتھ کوٹھی کے قریب آگیا۔ مخبر کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ کامرانی کسی وجہ سے اسلام آباد نہیں گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کوٹھی کا مالی ایک چادر لپیٹے کھانستا ہوا احاطے کے گیٹ سے باہر آیا پھر ایک طرف جانے لگا۔ آگے جاکر سردارا اور اس کے ساتھیوں نے اسے گھیر لیا۔

ایک نے پوچھا۔ "اتنی رات کو کدھر جارہا ہے؟"

اس نے گھبرا کر انہیں دیکھا پھر کہا۔ "میتوں جتھ لا کے ویکھو... بخار اے۔ کھانس رہا ہوں۔ اسپتال سے دوا لینے جا رہا ہوں۔"

"کیا جناب عالی کوٹھی میں ہیں؟"

"نہیں... ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنی گڈی میں کدھرے گئے نیں۔"

سردارا نے حیرانی سے پوچھا۔ "ایں ویلے...؟"

بابے نے کہا۔ "فیصل آباد گئے ہوں گے۔"

مالی نے کہا۔ "او نہیں نہیں۔ اتنی دور جاتے تو محافظوں کو نال لے کے جاتے۔ وہ تو کلّے (اکیلے) گئے ہیں۔"

بابے نے کہا۔ "کلّا (اکیلا) تے شیطان کدھرے جاتا ہے... وہ کہاں گیا ہوگا؟"

بشارت سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "کوئی لمبا چکر چل رہا ہے۔"

سردارا نے کہا۔ "کیا چکر ہے؟ یہ تو بگا جیسا شیطان ہی بتائے گا۔ چلو... چلو ادھرے..."

وہ وہاں سے چلتے ہوئے تھانے کی طرف آگئے۔

ایسے وقت بگا سپاہیوں کے ساتھ اپنی جیپ میں وہاں پہنچ گیا۔ بابے اور بشارت چھپ چھپ کر تھانے کے اندر جھانکتے ہوئے معلومات حاصل کرنے لگے۔ پھر سردارا کے پاس آکر بولے۔ "اندر آٹھ سپاہی ہیں۔ تین مسلح ہیں۔ حوالات میں ہمارے کارندوں کو بند کیا گیا ہے۔"

وہ تینوں تاریکی میں چھپتے ہوئے تھانے کے بیرونی دروازے پر آئے۔ وہاں دو سپاہی موجود تھے۔ انہوں نے ان پر حملہ کرکے ہتھیار چھین لیے۔ بگا اپنی کرسی پر بیٹھا لاک اپ کی طرف دیکھتے ہوئے کارندوں سے کہہ رہا تھا۔ "تم میں جو سردارا کا پتا بتائے گا، اسے رہائی بھی ملے گی اور انعام بھی ملے گا۔"

سردارا نے اندر آتے ہی ایک مسلح سپاہی کو گولی مار کر زخمی کیا۔ بگا اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ وہ اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکالنا چاہتا تھا۔ سردارا نے اس کی کرسی پر گولی مارتے ہوئے کہا۔ "دوسری گولی تمہیں لگے گی بگا صاب...!"

وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟ ہم تو یار بیلی ہیں۔ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔"

"جب فون پر ملاقات طے ہوگئی تھی، کامرانی صاب بھی آنے والے تھے تو ان بے چاروں سے میرا پتا کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"وہ... وہ میں تم سے اکیلے میں ملنا چاہتا تھا۔"

"اچھا جی۔ تو مجھ سے ملنے کے لیے ان کارندوں کو رہائی کا اور انعام کا لالچ دے رہے ہو؟"

"اس لیے کہ لالچ کے بغیر مجھے کوئی تمہارے پاس نہ پہنچاتا۔"

"چلو، میں آگیا ہوں۔ اب بولو... کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

بشارت نے پاس آکر اس کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ وہ بولا۔ "سردارا! یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔"

"میرے لیے اچھے رہو گے تو زندہ رہو گے۔ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ یہ بتاؤ بشریٰ کہاں ہے؟"

"یہی معلوم کرنے کے لیے تم سے ملنا چاہتا تھا۔"

سردارا نے فائر کیا۔ گولی بگا کے سامنے میز کی سطح سے لگ کر دوسری طرف چلی گئی۔ اس نے بڑی سفاکی سے پوچھا۔ "کیا حرام موت مرنا چاہتے ہو؟ سچ بولو! میری عقل کہتی ہے کہ تم نے اسے اغوا کرایا ہے۔ وہ شکارگاہ میں ہے اور کامرانی صاب اتنی رات کو وہیں گئے ہیں۔"

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو؟ کامرانی صاحب اتنی رات کو باہر نہیں نکلتے۔ پتا نہیں بشریٰ کو کس نے...؟"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دھیرے دھیرے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک گولی اس کے شانے کی ہڈی کو توڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔

بابے ابلیس نے کہا۔ "اوئے تھانے دارا! اب بھی تجھے زندگی مل سکتی ہے۔ سچ بول دے۔"

بشارت نے اسے نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر بتا دے کیا کامرانی صاب شکارگاہ میں ہیں؟"

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ سردارا نے کہا۔ "مجھے تمہارے جھوٹ سچ پر اعتبار نہیں ہے۔ فوراً کامرانی صاب سے بات کراؤ۔"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے ریسیور اٹھانا چاہتا تھا۔ سردارا نے کہا۔ "رک جاؤ۔ موبائل فون سے بات کرو۔"

اس نے بے بسی سے دیکھا۔ پھر میز پر رکھے ہوئے فون کو اٹھا کر نمبر پنچ کرنے لگا۔ دوسری طرف دیر تک بیل جاتی رہی پھر کامرانی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو! کیا بات ہے؟ بولو...!"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ "جناب عالی! سردارا میرے سامنے ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

سردارا نے اس سے فون چھین کر کان سے لگایا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ "تمہیں کیا ہوا ہے؟ میں کراہنے کی آوازیں سن رہا ہوں؟"

"آپ درست سن رہے ہیں۔ ابھی یہ زخمی ہوا ہے۔ اگر میرا مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو اس کے ساتھ آپ کی بھی نمازِ جنازہ پڑھائی جائے گی۔"

"تمہارا مطالبہ کیا ہے؟"

"مجھے اور میرے ساتھیوں کو ابھی اپنی گاڑی میں پشاور لے جاؤ گے اور سرحد پار کراؤ گے۔"

"مجھے منظور ہے۔ ابھی شکارگاہ میں چلے آؤ۔"

"آتو رہا ہوں... پر یاد رکھو ایک ذرا بھی چالاکی دکھاؤ گے تو میں تمہاری لاش گرائے بغیر نہیں مروں گا۔ اچھی طرح سوچ لو... میں آرہا ہوں۔"

اس نے فون بند کرکے ساتھیوں سے کہا۔ "اپنے کارندوں کو لاک اپ سے نکالو۔"

پھر اس نے بگا کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "تمہارے جیسے پولیس والوں کی یہی کم بختی ہوتی ہے، کبھی قانون کے پھندے میں نہیں آتے۔ اپنے ہی پالتو بدمعاشوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہو۔"

یہ کہتے ہی اس نے دو فائر کیے۔ وہ کرسی سے گر کر فرش پر پہنچا پھر وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔

☆☆☆

شوکت علی کامرانی کی ہوس پوری ہونے والی تھی۔ جس کا رشتہ دینے سے انکار کیا گیا تھا، وہ اس کی عزت کی دھجیاں اڑانے والا تھا۔ یہ طے پایا تھا کہ جب تک دل نہیں بھرے گا، تب تک وہ ہوس کا کھیل جاری رکھے گا۔ اس کے بعد اسے بگا کے حوالے کردے گا۔ پھر اس کی لاش کسی کو نہیں ملے گی۔

وہ اپنی شکارگاہ میں پہنچا۔ احاطے کے گیٹ پر دو مسلح بندے پہرا دے رہے تھے۔ انہوں نے بڑے آہنی دروازے کو کھول کر سیلوٹ کیا۔ وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا عیش کدے کے بیرونی دروازے کے سامنے آگیا۔ وہاں بھی دو مسلح افراد نے اسے سیلوٹ کیا۔ سلطان بگا نے اس کی سیکیورٹی کے لیے خاطر خواہ انتظامات کیے تھے۔ وہ کار سے اتر کر فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا چار دیواری کے اندر آیا۔ کوئی اسے روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔

خواب گاہ کا دروازہ بند تھا مگر مقفل نہیں تھا۔ وہ اسے کھول کر اندر نہیں گیا۔ وہیں رک کر مسکراتے ہوئے مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ بیڈ کے سرے پر بشریٰ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی۔

وہ قریب آتے ہوئے بولا۔ "آرام سے بیٹھو۔ اب تو تمہیں اسی چار دیواری میں جینا اور مرنا ہے۔"

وہ سہمی ہوئی سی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "شوکت کامرانی صاحب! آپ مجھ سے دشمنی کیوں کر رہے ہیں؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "میں تو دوستی اور رشتے داری چاہتا تھا۔ دشمنی تمہارے باپ نے کی ہے۔ مجھ سے پہلے سردارا تمہیں طلب کرنے گیا تھا۔ سلامت علی نے صاف کہہ دیا کہ تمہارا رشتہ دارا شکوہ سے طے ہوچکا ہے۔ تمہاری شادی خاندان سے باہر نہیں ہوگی۔ پھر میں تمہارا طلب گار بن گیا۔"

وہ قریب آکر اس کے رخسار کو چھوتے ہوئے بولا۔ "تم ایسی سوہنی ہو کہ تمہیں دیکھتے ہی رال ٹپکنے لگتی ہے۔"

بشریٰ اس کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے ایک قدم پیچھے چلی گئی۔ وہ بولا۔ "پھر میں نے سوچا، بانس نہیں رہے گا تو بانسری بھی نہیں بجے گی۔ نہ دارا شکوہ رہے گا، نہ تمہارا باپ مجھے جنوائی بنانے سے انکار کرے گا۔ اس لیے میں نے تمہارے منگیتر کو ہمیشہ کے لیے اوپر پہنچا دیا۔"

اس نے گھور کر پوچھا۔ "کیا آپ نے دارا شکوہ کو قتل

کیا تھا؟"

"ایسے کام سردارا میرے لیے کرتا ہے۔ اس نے میری مشکل آسان کر دی۔ پھر بھی تمہارے باپ نے یہ کہہ کر میری توہین کی۔ مجھے غصہ دلایا کہ وہ تمہاری جوانی کو فرمان اکبر کی جھولی میں ڈالنے والا ہے۔"

وہ بولی۔ "اور تم نے توہین برداشت نہیں کی۔ مجھے بازاری چیز سمجھ کر میرے گھر سے اٹھوا لیا۔ اپنی اس شکار گاہ میں لے آئے۔ اس کا مطلب ہے، تم ہی نے سردارا کو قانون کی نظروں سے چھپا رکھا ہے؟ اسی سے یہ واردات کرائی ہے؟"

"اونہہ۔ وہ کتا تو کہیں لگ چھپ گیا ہے۔ یہ واردات تو میں..."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "خوامخواہ پولیس والوں کی طرح سوالات نہ کرو۔ آؤ... میری آغوش میں آ جاؤ۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا۔ بشریٰ نے زوردار طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "کتے... کمینے! جا کر اپنی ماں کو آغوش میں لے۔ سوالات اس لیے کر رہی ہوں کہ یہاں جو بات کی ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔"

وہ اس توہین کو بھول گیا کہ ایک لڑکی نے طمانچہ مارا ہے۔ ایک دم سے چونک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے ہی بیڈ پر بڑا سا ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا۔ وہ فوراً ہی ادھر لپکا۔ اس ریکارڈر میں سے کیسٹ نکال کر اسے ضائع کرنا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت پیچھے سے ایک لات پڑی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے جاتا ہوا اوندھے منہ گر پڑا۔ پھر غصے سے پلٹ کر دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ سامنے فرمان اکبر کھڑا ہوا تھا۔

وہ فرش سے اٹھنا چاہتا تھا۔ فرمان نے منہ پر ایک ٹھوکر ماری۔ وہ پھر گر پڑا۔ اس کی باچھوں سے لہو رسنے لگا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "یہ... یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ میرے اعلیٰ مرتبے کا لحاظ کرو۔ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔"

"ابھی تو معمولی آدمی تم سے افضل اور برتر ہے... کیونکہ وہ تمہاری طرح لاتیں جوتے نہیں کھا رہا ہے۔ کیا حیثیت ہے تمہاری؟ نالی کے کیڑے کی طرح فرش پر پڑے ہو۔"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ فرمان نے کہا۔ "ہاں سوچو... تمہارے پالتو غنڈے مدد کے لیے کیوں نہیں آ رہے ہیں؟"

اس نے پھر کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔

فرمان نے کہا۔ "تم سپاہیوں کو نہیں پہچانتے اس لیے دھوکا کھا گئے۔ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہاں چلے آئے۔ باہر بگا کے نہیں میرے ماتحت کھڑے ہیں۔"

وہ فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے سمجھوتا کر لو۔ جتنی رقم چاہو گے ملے گی۔"

"تم مجھے کتنی رقم دے کر خرید سکتے ہو؟"

"جو مانگو گے دوں گا۔ پانچ لاکھ... دس لاکھ!"

"صحیح بولی لگاؤ۔ ہماری باتیں ریکارڈ ہو رہی ہیں۔"

اس نے گھبرا کر ٹیپ ریکارڈر کی طرف دیکھا۔ فرمان نے کہا۔ "میں بول رہا ہوں، تم سنو۔ میں تمہارے تاوان سے نہیں گیا تھا، جانے کا ڈراما کیا تھا تاکہ تم سب کو کھل کر کھیلنے کے لیے کھلا میدان مل جائے۔ میرا خیال تھا، سردارا تم سے اور بگا سے ملنے آئے گا۔ بشریٰ اور شنو کی مخبری سے منشیات کا دھندا چوپٹ ہو گیا ہے۔ اسے فرار ہونا پڑا۔ مجھے یقین تھا، وہ مخبری کرنے والیوں سے انتقام لینے ضرور آئے گا۔"

بشریٰ نے کہا۔ "اور ایسا ہی کچھ ہوا۔ جب اغوا کرنے والے میرے گھر کا دروازہ توڑ رہے تھے تو میں نے فون پر فرمان کو اطلاع دی تھی۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں راضی خوشی مجرموں کے ساتھ چلی جاؤں۔"

فرمان نے کہا۔ "میں سمجھ رہا تھا، سردارا واردات کرنے آیا ہے۔ میں اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تو پتا چلا! تم نے کسی دوسرے بدمعاش کی خدمات حاصل کی ہیں۔ وہ نیا بدمعاش اپنے ساتھیوں سمیت ہماری حراست میں ہے۔"

کامرانی نے ریکارڈر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پلیز! اسے بند کر دو۔"

اسی وقت کھٹ کی آواز کے ساتھ ریکارڈر رک گیا۔ بشریٰ نے کہا۔ "ایک سائیڈ پوری ریکارڈ ہو چکی ہے۔ میں سائیڈ بدل رہی ہوں۔"

کامرانی نے جلدی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے لیے میری بات مانو۔ اسے آن نہ کرو۔ کسی بھی شرط پر مجھ سے سمجھوتا کر لو۔"

"تم یہی کہتے رہو گے اور میں انکار کرتا رہوں گا۔ جب تمہارے خلاف قانونی کارروائی شروع کروں گا تو یقین کر لو گے کہ میں پتھر ہوں۔ مجھے بڑے سے بڑا لالچ دے کر پگھلا نہیں سکو گے۔"

وہ پریشان تھا۔ یہ یقین ہو رہا تھا کہ فرمان کے شکنجے سے نکل نہیں پائے گا۔ اس نے کہا۔ "کم از کم ایک بات مان لو۔ مجھے بگا سے فون پر بات کرنے دو۔"

"ہوں۔ مجھے اس سے بھی نمٹنا ہے۔ تم اسے اپنے موجودہ حالات نہیں بتاؤ گے۔ اسے یہاں بلاؤ گے اور باتیں کرو گے۔ فون پر میری مرضی کے خلاف کچھ بولو گے تو میں..."

"میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ زیادہ باتیں نہیں کروں گا۔"

ایسے ہی وقت اس کے فون سے ٹون سنائی دینے لگی۔ فرمان نے آگے بڑھ کر اس کی جیب سے فون نکال لیا۔ اسکرین پر سلطان بگا کا نام دکھائی دے رہا تھا۔ وہ فون اسے دیتے ہوئے بولا۔ "تمہاری خواہش پوری ہو رہی ہے۔ بگا سے زیادہ بات نہ کرنا۔ اسے فوراً یہاں آنے کو کہو۔"

وہ بٹن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ "ہیلو! کیا بات ہے؟ بولو...!"

ادھر سے بگا کی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ کامرانی سے بول رہا تھا کہ سردارا اس کے سامنے ہے اور اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ پھر چند لمحوں بعد سردارا کی آواز سنائی دی۔ معلوم ہوا، اس نے بگا کی پٹائی کی ہے۔ وہ بگا کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ ابھی وہ زخمی ہوا ہے۔ اگر اس کا مطالبہ پورا نہ ہوا تو بگا کے ساتھ اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھائی جائے گی۔ پھر اس نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

فرمان نے فون کا اسپیکر آن رکھا تھا، اس لیے وہ تمام باتیں سن رہا تھا۔ اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کامرانی سے کہا۔ "اس سے کہو مطالبہ پورا کیا جائے گا۔ اسے ابھی یہاں بلاؤ۔"

کامرانی نے سردارا سے یہی کہا۔ سردارا نے جواب دے کر فون بند کر دیا۔ ادھر فرمان نے کامرانی کا فون اپنی تحویل میں لے کر ایک ماتحت کو بلا کر کہا۔ "سردارا ابھی یہاں پہنچنے والا ہے۔ یقیناً اس کے ساتھ مسلح ساتھی بھی ہوں گے۔ انہیں بہت سوچ سمجھ کر ٹریپ کرنا ہے۔"

پھر وہ پلاننگ کرنے لگے۔ دوسرے ماتحتوں کو بھی بلا لیا گیا۔ ان سب نے سمجھ لیا کہ آنے والوں سے کس طرح نمٹنا ہے۔ کامرانی فرش پر بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے وہاں سے اٹھنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس کی ایسی تذلیل ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت فرمان کے رحم و کرم پر تھا۔

اسے یقین تھا کہ وقتی طور پر یہ ذلت برداشت کر لے گا تو بعد میں فرمان اسے دوسرے افسران کے حوالے کر دے گا۔ پھر وہاں سے نجات حاصل کرنے کے بعد ہی وہ فرمان کے خلاف کچھ کر سکے گا۔ وہ اقتدار کی اونچی کرسی پر بیٹھنے والا فی الحال زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔

فرمان کے ماتحت جا چکے تھے۔ اس نے بشریٰ سے کہا۔ "تم دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ اور کھڑکی بند کر لو۔ جب تک میں آواز نہ دوں، دروازہ نہ کھولنا۔"

وہ وہاں سے چلی گئی۔ وہ کامرانی سے بولا۔ "تم بہت شہ زور ہو۔ یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ تمہارے جیسے چند شہ زوروں نے پوری قوم کو کمزور بنا رکھا ہے۔ ساٹھ برس گزرنے کے بعد بھی ایسے آثار نظر نہیں آتے کہ کبھی قانون کی حکمرانی ہو گی اور انصاف غریب کی دہلیز تک پہنچے گا۔"

وہ ٹہلنے کے انداز میں ادھر سے اُدھر جاتے ہوئے بولا۔ "تم لوگ صرف اس لیے طاقتور ہو کہ تمہارے پاس دولت، سیاسی مکاری اور مسلح گارڈز ہیں۔ انہی کے بل بوتے پر تم اقتدار کا ننگا ناچ ناچتے ہو۔ یہ تین چیزیں چھین لی جائیں تو تم مٹی کے کیڑے بن جاؤ گے۔ جیسے ابھی کیڑے کی طرح زمین پر بیٹھے ہوئے ہو۔"

وہ ایک جگہ رک کر بولا۔ "سہ زوری... یعنی تین قوتیں... دولت، سیاسی مکاری اور مسلح فورس... یہی سہ زوری تمہیں شہ زور بناتی ہے۔ مرنے کے بعد کچھ نہیں رہتا۔ آج مرنے سے پہلے تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔"

اس کے ماتحت نے فون پر اطلاع دی۔ "سر! وہ تینوں بڑے محتاط انداز میں چھپتے ہوئے آ رہے ہیں۔ اس شکار گاہ کا جائزہ لے رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔"

اس نے کامرانی سے کہا۔ "اس کھڑکی کے باہر میرا ایک گن مین ہے۔ تم اس کے نشانے پر رہو گے۔ ٹیپ ریکارڈر کو بند نہیں کرو گے اور سردارا سے کھل کر باتیں کرو گے۔"

وہ ریکارڈر کو آن کر کے خواب گاہ سے باہر چلا گیا۔ کامرانی نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک گن مین موجود تھا۔ اس نے ایک ریوالور کامرانی کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "اس میں صرف ایک گولی ہے۔ اسے اپنے بچاؤ کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "سردارا کے ساتھ اس کے مسلح ساتھی بھی ہوں گے؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ کھڑکی بند ہو گئی۔ باہر حدِ نظر تک تاریکی تھی۔ صرف شکار گاہ کی چار دیواری میں ایک کمرا اور کوریڈور روشن تھا۔ وہ تینوں ایک جگہ رک گئے۔ ایک نے کہا۔ "باہر کامرانی صاحب کے گارڈز یا ملازم نہیں ہیں۔ اندر ایسی

خموشی ہے جیسے وہاں کوئی نہ ہو۔"

سردارا فون نکال کر کامرانی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسی لمحے وہ تینوں اسپاٹ لائٹ کی روشنی میں نہا گئے۔ انہوں نے ایک دم سے اچھل کر اپنی گنیں سنبھالیں۔ روشنی کے دائرے سے باہر جانا چاہا مگر تڑاتڑ گولیوں کی بوچھاڑ نے بشارت اور بابے کو اوندھے منہ گرا دیا۔

سردارا نے فوراً ہی گن پھینک کر چیختے ہوئے کہا۔ "میں نہتا ہوں۔ گولی نہ چلاؤ۔"

فائرنگ بند ہو گئی۔ سردارا کو فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے جیب سے فون نکال کر بٹن دباتے ہوئے کان سے لگایا۔

"ہیلو...!"

فرمان کی آواز سنائی دی۔ "کامرانی صاحب انتظار کر رہے ہیں۔ اندر جاؤ۔"

وہ بولا۔ "سر! میں گرفتاری پیش کر رہا ہوں۔ آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں..."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "شٹ اپ۔ اندر جاؤ گے یا یہیں مرو گے؟ کم آن... اندر جاؤ۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا عیش کدے کے بیرونی دروازے پر آیا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے کوریڈور میں آ کر لباس کے اندر سے ریوالور نکال لیا۔ مرنا تو تھا ہی مگر دو، چار کو مار کر مرنا چاہتا تھا۔ سامنے خواب گاہ کا دروازہ ایک ذرا سا کھلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں سے کامرانی کی آواز سنائی دی۔ "آ جاؤ... میں تمہارا مطالبہ پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

وہ بولا۔ "آپ باہر آ کیں۔"

فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اسے کان سے لگا کر سنا۔ فرمان نے سخت لہجے میں کہا۔ "وقت برباد نہ کرو۔ اندر جاؤ۔"

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "نہ جاؤں تو کیا فرق پڑے گا؟ وہاں بھی موت ہے... یہاں بھی موت!"

فون بند ہو گیا۔ چند لمحوں بعد پھر تڑاتڑ کی آوازوں کے ساتھ گولیاں چلنے لگیں۔ وہ گولیاں اس کے قدموں کے پاس فرش پر لگ رہی تھیں۔ ان سے بچنے کے لیے وہ باہر نہیں جا سکتا تھا۔ دوڑتا ہوا خواب گاہ میں آ گیا۔ شکار کو اسی طرح ہانکتے ہوئے صحیح ٹارگٹ تک پہنچایا جاتا ہے۔

کامرانی بیڈ کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ دروازے کی طرف نشانہ لگائے بیٹھا تھا۔ ایک ہی گولی تھی جو اسے زندگی... اور دشمن کو موت دے سکتی تھی۔

سردارا جیسے ہی اندر آیا، اس نے بڑی مہارت اور ہوشیاری سے ٹریگر دبایا۔ اکلوتی گولی کام آ گئی اور سردارا کے سینے میں جا کر پیوست ہو گئی۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی زمین بوس ہو گیا۔

کامرانی کو جیسے نئی زندگی مل گئی تھی۔ وہ بیڈ کے پیچھے سے نکل کر تیزی سے چلتا ہوا سردارا کے ریوالور کی طرف آیا۔ وہ اسے اٹھانا چاہتا تھا مگر اٹھا نہ سکا۔ ایک گولی اس کے ہاتھ پر آ کر لگی۔ وہ پیچھے چلا گیا۔ فرمان کو دیکھنے لگا۔ فرمان نے جھک کر سردارا کا معائنہ کیا۔ اس میں جان تھی۔ وہ زندہ رہنے کے لیے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

فرمان نے اسے سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "اپنا ریوالور اٹھاؤ۔ تم میں اتنی جان ہے کہ انتقام لے سکتے ہو۔"

کامرانی نے سہم کر پیچھے ہٹتے ہوئے پوچھا۔ "یہ... یہ کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کیا کر رہے ہو؟"

"مجھے یہ کرنا ہوگا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارے خلاف جو ثبوت جمع کیے ہیں، انہیں عدالت تک پہنچنے سے پہلے ہی ضائع کر دیا جائے گا۔ شیطان کبھی نہیں مرتا۔ تمہارے جیسے سیاست دان کبھی نہیں مرتے۔ یہاں سہ زوری... یعنی تین طاقتوں میں سے ایک طاقت ٹوٹ گئی۔ کسی بھی سیاسی مکاری سے کام نہیں لے سکو گے۔ اسلحے کی قوت بھی تمہارے پاس نہیں ہے، تمہارے کارندے کے پاس ہے۔"

سردارا کا دم نکل رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ریوالور کو اٹھا لیا۔ فرمان نے کہا۔ "یہ سردارا تمہارا سب سے بڑا اور مضبوط ہتھیار تھا۔ بندہ کبھی کبھی اپنے ہی ہتھیار سے مارا جاتا ہے۔"

اس نے سردارا کا ریوالور والا ہاتھ تھام لیا۔ ایسے میں نشانہ نہیں چوک سکتا تھا۔

موت کے گونجتے ہوئے اعلان کی طرح ایک گولی چلی...

سہ زورا اچھل کر فرش پر گرا... پھر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

ادھر سردارا ریوالور پر اپنی انگلیوں کے نشانات چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا تھا۔

فرمان وہاں سے چلتا ہوا دوسرے کمرے کے دروازے پر آیا۔ پھر دستک دیتے ہوئے بولا۔ "دروازہ کھولو بشریٰ! انصاف کی صبح ہو رہی ہے۔"

※